اِنۡ اُرِیۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ

مئی ۲۰۲۰ء

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر ڈاکٹر محمد امین

CPL No. 296 May 2020

ڈاکٹر محمد امین کی تازہ تالیفات

اسلام اور ردِّ مغرب

مغربی تہذیب خلافِ اسلام ہے اور اس کا ردّ شرعاً واجب ہے

مدرسہ ڈسکورسز

مطالعہ و تجزیہ

تحریک انصاف کی سیکولر

حکومت کا یکساں قومی نصاب قابل ردّ ہے

ایک تجزیہ، ایک مطالعہ

مکتبہ البرہان، لاہور

آن لائن مطالعہ کے لیے ڈاکٹر صاحب کی فیس بک سے لنک لے لیں یا مندرجہ ذیل ای میل اور واٹس ایپ سے سافٹ کاپی طلب کریں۔

فون نمبر: 03004354673، ای میل ermpak@hotmail.com

خدمتِ قرآن میں ڈاکٹر محمد امین کا ایک اور منفرد کام

''قرآنی الفاظ کے ترجمے کی بجائے قرآن کی عربی عبارت کے مفہوم کی اردو میں منتقلی''
اسلاف اور جمہور مفسرین کی مطابقت کے ساتھ

رواں، سلیس اور شستہ اسلوب
صرف اردو ترجمہ پڑھیں تو بھی لطف آئے اور بات پوری طرح سمجھ میں آئے
اور تفسیر و حواشی سے بڑی حد تک بے نیاز کرے

پنج سورہ

الفاتحہ، یٰسٓ، الرحمن، الواقعہ، الملک و پارہ عمّ

سفید کاغذ اور مضبوط گتے کی جلد، صفحات ۷۶

رمضان المبارک میں بلا معاوضہ طلب فرمائیں

مکتبہ البرہان

A-97 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

فون:0309-4607124، ای میل ermpak@hotmail.com

بلا معاوضہ طلب کریں

سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور قرآنی حلقوں میں
قرآن حکیم کا ترجمہ سکھانے کی منفرد کتاب

تدریس القرآن ①

- صرف ایک پارہ پڑھنے سے سارے قرآن کا ترجمہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔
- پانچویں سے اوپر کی جماعتوں کے لیے موزوں
- جدید اور سائنٹفک انداز۔ عربی گرامر کی الجھنوں اور رٹے سے دور
- اساتذہ اور طلبہ (و طالبات) کے لیے الگ کتابیں
- اساتذہ کے لیے فری ٹریننگ

تدریس القرآن فاؤنڈیشن

97-A نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور،
فون: 0333-4287640، 0309-4607124

ماہنامہ البرہان لاہور
جلد ۲۴، شمارہ ۵، مئی ۲۰۲۰ء/ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ

مشمولات

O فکرو نظر

’اورالبرہان یتیم ہو گیا‘ ۴

O تعلیم و تربیت

- تعلیمِ اقدار (Values Education) کا لائحہ عمل — پروفیسر ملک محمد حسین ۶
- بچوں کو خود تعلیم دینے کا منفرد منصوبہ — ڈاکٹر نویدہ کوثر ۱۷

O کرونا

- ایک خط: عمران احمد خان نیازی کے نام ۱۹
- کرونا، اسلام اور مغرب — ڈاکٹر محمد امین ۲۱
- مولانا طارق جمیل صاحب کا آدھا سچ ۳۱
- مساجد کی بندش، سندھ حکومت کا سفاکانہ رویہ ۳۵

O فہم دین

- غامدی متجددین کا باغیانہ رویہ — ڈاکٹر حافظ محمد زبیر ۳۶
- تراویح کے خلاف غامدی صاحب کا گمراہ کن موقف — مدیر ۳۸

O اسلام اور عصر حاضر

عصر حاضر میں اسلام کو درپیش چیلنج — سید سعادت اللہ حسینی ۴۵

O ملی مجلس شرعی

- کرونا کے حوالے سے ملی مجلس شرعی کی قراردادیں — ادارہ ۵۹
- علماء کرام کے نام کھلا خط — مدیر ۶۱

O تفہیم مغرب

- جدید ٹیکنالوجی کے نقصانات اور مسلم دنیا — ڈاکٹر حسین نصر ۶۳
- روایتی اور مسلم معاشروں پر مغربی جدیدیت کے تباہ کن اثرات — سید خالد جامعی ۶۷

فکر و نظر

’اور البرہان یتیم ہو گیا‘

جناب بشیر احمد عارف صاحب کا سانحۂ ارتحال

جناب بشیر احمد عارف صاحب جماعت اسلامی کے رکن اور اس کے ناظم مالیات تھے۔ عمر بھر جماعتی سرگرمیوں میں فعال حصہ لیا۔ بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ عمر کا ایک بڑا حصہ داؤد سیٹھ گروپ کی بوریوالہ مل میں گزارا اور انتہائی اہم عہدوں پر فائز رہے۔ اس کے بعد زندگی جماعت کے لیے وقف کر دی۔ وہ مخلص تھے، سخت منتظم اور اکل کھرے انسان تھے جو ان کے کام و منصب کا تقاضا بھی تھا۔ ہمارے علم میں بھی ہے اور جناب لیاقت بلوچ صاحب نے ان کے لیے تعزیتی کلمات کہتے ہوئے اس کا برملا اقرار بھی کیا کہ وہ نہایت جرأت سے جماعتی قیادت کو، جہاں ضرورت محسوس کرتے، مالی معاملات میں ٹوک دیتے تھے، جو ان کا منصبی تقاضا بھی تھا اور اللہ کے سامنے حضوری کا تقاضا بھی۔

وہ ان نادر لوگوں میں سے تھے جنہیں راقم کے ٹوٹے پھوٹے خیالات اور چھوٹی موٹی عملی کوششوں سے اتفاق تھا اور وہ ہماری بھرپور تشجیع اور مالی معاونت کرتے تھے اور دوستوں (خصوصاً عبدالرحمن میر صاحب، چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ) سے بھی فنڈز لے کر دیتے تھے لیکن خاموشی سے۔ نہ انہوں نے کبھی اس کا اظہار و اعلان کیا اور نہ ہم نے۔ یوں کہنا چاہیے کہ وہ ہمارے واحد مالی سرپرست تھے اور ادارہ ان کی وفات پر اپنے آپ کو یتیم محسوس کرتا ہے۔

اگرچہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا یقین ہے کہ انسان اپنے لیے اور اپنے دینی و دینوی مقاصد کے لیے جو بھی جدوجہد کرتا ہے، اس کا رزق اللہ کی طرف سے مقرر ہوتا ہے جس میں کوئی کمی بیشی نہیں کر سکتا۔ تاہم یہ بات اس کی نقیض نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے دنیاوی سہارے اور اسباب و افراد بھی پیدا فرماتا ہے اور انسان کو ان کی محرومی سے صدمہ ہونا بھی فطری ہے جیسے ہمارے پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام کو حضرت ابوطالب کی وفات پر ہوا تھا۔

ہمیں بھی جناب بشیر احمد عارف صاحب کے انتقال کا صدمہ ہے لیکن ہم صدمے کے

باوجود اللہ کی رضا پر راضی ہیں۔ وہ اگر چاہے گا تو وہاں سے ہمارے ادارے کے لیے رزق کا انتظام کردے گا، جس کا ہمیں گمان بھی نہیں اور اگر اس کو یہ منظور نہیں تو بھی ہم اس کی رضا پر راضی ہیں۔ لیکن ہم چونکہ جدوجہد کے مکلف ہیں لہٰذا ہم ہر اس شخص سے جسے ہماری کاز سے اتفاق اور دلچسپی ہے، عرض کرتے ہیں کہ وہ ادارے کو زندہ اور فعال رکھنے بلکہ اس کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے دست تعاون دراز کرے۔ **واجرھم علی اللہ. حسبنا اللہ ونعم الوکیل. نعم المولی ونعم النصیر.**

ہم اللہ کے حضور دعا گو ہیں کہ وہ جناب بشیر احمد عارف صاحب کی مغفرت فرمائے، ان کی حسنات کو قبول فرمائے اور ان کی بشری لغزشوں سے درگزر فرمائے۔ ان کی قبر، حشر اور حساب کی منزلوں کو آسان فرمائے۔ انہیں جنت الفردوس عطا فرمائے اور ہمیں ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ **اَللّٰھُمَّ لاَ مَانِعَ لِمَا أَعْطَیْتَ وَلاَ مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ وَلاَ یَنْفَعُ ذَا الجَدِّ مِنْكَ الجَدُّ وَ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ.**

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنائیے۔

زرِاعانت: سالانہ 500 روپے　　پانچ سال: 2000 روپے　تاحیات: 10,000 روپے

نام..

پتہ..

فون..

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ A-97 نیلم بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور بھجوائیے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں

تعلیم و تربیت

پروفیسر ملک محمد حسین

نصاب و نصابی کتب میں اسلامی تناظر میں طلبہ کی تعمیر سیرت و کردار کے لیے

تعلیمِ اقدار (Values Education) کا لائحہ عمل

ابتدائیہ

وفاقی تعلیم کی وزارت نے یکساں قومی نصاب کے عنوان سے ایک مسودہ نصاب منظور کیا ہے جس میں ویلیوز ایجوکیشن کو اہمیت دیتے ہوئے ایک علیحدہ نصابی رپورٹ جاری کی ہے۔ ویلیوز ایجوکیشن کی یہ رپورٹ جن کور ویلیوز اور ذیلی ویلیوز کو نصاب تعلیم کا حصہ بنا رہی ہے وہ دراصل ہیومنزم کی ویلیوز ہیں جب کہ ویلیوز ایجوکیشن کی رپورٹ کے ساتھ انگلش لینگویج کی نصابی رپورٹ میں ہیومنزم کا بطور ایک قدر (Value) بھی واضح ذکر کیا گیا ہے۔

یہ اظہر من الشّمس ہے کہ ہیومنزم ایک مستقل نظام حیات ہے جس کی بنیاد اللہ کے انکار اور زندگی بعد موت کے انکار پر مبنی ہونے کے ساتھ اس کا اپنا ایک ورلڈ ویو ہے جو اسلام کے ورلڈ ویو سے مختلف بلکہ متضاد ہے۔

پاکستان ۹۷ فیصد مسلمانوں کا ملک ہے۔ اس کا آئین، آئین میں شامل قراردادِ مقاصد اور دیگر آئینی آرٹیکلز اسلامی نظامِ حیات، اسلامی ورلڈ ویو اور اسلامی اقدار کا تقاضا کرتی ہیں اس لیے نصاب تعلیم میں جن اقدار کا فروغ مطلوب ہے وہ اسلامی اقدار ہیں نہ کہ ہیومنزم، سیکولرزم اور لبرلزم کی غیر اسلامی اقدار۔ اسی ضرورت کے تحت ہم اسلامی اقدار پر مبنی ویلیوز ایجوکیشن کا پورا نظام تجویز کر رہے ہیں جو اسلام کا تقاضا ہے، ہمارے آئین کا تقاضا ہے اور قومی سلامتی کے ساتھ عالمی امن کا تقاضا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ صرف اسلامی اقدار کی تعلیم سے ہی امن، سلامتی معاشرتی استحکام، عالمی امن، برداشت، رواداری اور اختلاف رائے کے احترام کا فروغ اور ترویج ہوسکتی ہے۔

اقدار کی ضرورت اور اہمیت

انسان صرف مادی وجود ہی نہیں ایک اخلاقی وجود بھی رکھتا ہے۔ تعلیم جہاں مادی وجود کی

بہبود، افزائش اور تسلسل کے لیے کارفرما ہوتی ہے وہاں اُسے انسان کے اخلاقی وجود کے قیام، افزائش اور تسلسل کے لیے بھی کارفرما ہونا چاہیے۔ حقیقت بلکہ یہ ہے کہ انسان کا اخلاقی وجود اس کے مادی وجود کی خوش حالی اور تحفظ کے بھی کام آتا ہے اس لیے اخلاقی وجود کی نشوونما کے لیے تعلیم کو زیادہ حساس ہونا چاہیے۔ تعلیم جب اخلاقی وجود کی نشوونما اور تحفظ کے لیے اہتمام کرتی ہے تو اس عمل کو ہم تربیت کہتے ہیں۔ تعلیم انسان کے لیے بہت اہم لیکن تربیت کے بغیر ایسے ہی ہے جیسے شور زمین پر بارش ہوئی لیکن روئیدگی اور چمن آرائی حاصل نہ ہوئی۔ اخلاق کی بنیاد اقدار ہوتی ہیں جب کہ اقدار کا ماخذ نظام عقائد اور اس نظام عقائد سے حاصل ہونے والا وہ تصورِ کائنات ہے جو انسان کی زندگی کو معنی اور مقصد عطا کرتا ہے۔ ہماری ان گزارشات کے مطابق اصل اہمیت نظام عقائد اور تصورِ کائنات کی ہے جن سے وہ اقدار اخذ ہوتی ہیں جنہیں حاصل کر کے اور جن پر عمل کر کے انسان اپنا اخلاقی وجود متشکل کرتا ہے۔ اب مثلاً آپ کے نظام عقائد کی اساس لبرلزم، سیکولرزم اور ہیومنزم ہے تو ان سے اخذ ہونے والی اقدار نام کی حد تک وہی ہوسکتی ہیں جو اسلام کے نظام عقائد سے اخذ کی جاتی ہیں لیکن ان کا تصور اور احاطۂ اثر ایک جیسا نہیں ہوگا بلکہ کوئی قدر ایسی بھی ہوسکتی ہے جو لبرلزم، سیکولرزم اور ہیومنزم میں سرے سے قدر ہی نہ ہو جبکہ اسلام کے نظام عقائد اور تصورِ کائنات میں وہ قدر انسانی زندگی کی اہم ترین قدر ہو۔ اس سلسلہ میں چند مثالیں درج ذیل ہیں:

۱۔ **آزادیٔ اظہارِ رائے** لبرلزم، سیکولرزم اور ہیومنزم میں ایک اہم قدر ہے جب کہ اسلامی نظام زندگی میں بھی یہ اہم قدر ہے۔ فرق یہ ہے کہ اسلام میں آزادیٔ اظہارِ رائے اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکامات کے تابع ہے جب کہ لبرلزم، سیکولرزم اور ہیومنزم میں آزادیٔ اظہارِ رائے بغیر کسی قدغن کے لامحدود ہے۔

۲۔ **عوام کی مرضی** طاقت، حکمرانی اور قانون سازی کا سرچشمہ ہے۔ یہ قدر لبرلزم، سیکولرزم اور ہیومنزم کے جمہوری اصولوں کے مطابق لامحدود ہے جبکہ اسلام میں یہ قدر انسان کے اللہ کا عبد اور خلیفہ (نائب) ہونے کے ناطے اللہ کی منشا کے تابع ہے۔

۳۔ **حیا** اسلام کی ایک اہم قدر ہے جس پر عمل نہ ہونے سے اخلاقی فساد اور پھر اس کے

نتیجے میں معاشرتی فساد پیدا ہوتا ہے جبکہ لبرلزم، سیکولرزم اور ہیومنزم میں حیا سرے سے کوئی قدر ہی نہیں ہے۔ حیا کا تعلق انسان کے جنسی رویے، اختلاط مرد وزن اور اس کے لباس وغیرہ سے ہے۔ لبرلزم، سیکولرزم اور ہیومنزم کا تصورِ زندگی انسان کی لامحدود آزادی کی قدر کے تحت اس پر کوئی قدغن لگانے کے لیے تیار نہیں جبکہ اسلام اسے ان حدود وقیود کا پابند بناتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دی ہیں۔

ہماری اوپر بیان کی گئی دو تین مثالیں اس بات کو واضح کرتی ہیں کہ وہ نظام عقائد، وہ تصورِ حیات اور وہ تصورِ کائنات اہم ہے جس سے اقدار اخذ کی جارہی ہیں۔

اسلام چونکہ آفاقی نظامِ حیات ہے، یہ پوری انسانیت کے لیے ہے اور قیامت تک آنے والے زمانوں کے لیے ہے اس لیے اسلام کے نظامِ حیات سے اخذ ہونے والی اقدار آفاقی اقدار ہوں گی اور وہی اور صرف وہی اقدار انسان کے اخلاقی وجود کی بہترین نشوونما اور بہترین تحفظ کریں گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم تعلیم میں اسلامی نظریۂ حیات پر مبنی اقدار کے فروغ کی بات کرتے ہیں اور ہیومنزم کی اساسی اقدار کی بجائے اسلام کی اساسی اقدار توحید، رسالت، آخرت اور عبادت پر زور دینے کی تلقین کرتے ہیں۔ توحید ہی وہ ام الاقدار ہے جو انسانی وحدت، انسانی عظمت، انسانی تنوع کے احترام اور انسانی شرف وآزادی کو یقینی بناتی ہے۔ رسالت ہی وہ اساسی قدر ہے جس سے خیر، عدل، امن وسلامتی، احترامِ انسانیت اور خوش حالی ومسرت کے چشمے پھوٹتے ہیں اور آخرت ہی ایک اساسی قدر ہے جس میں اللہ کے سامنے جوابدہی کا احساس انسان کو ہر حال میں راہِ راست پر رکھتا ہے۔ عبادت جو اللہ کی رضا اور اس کی اطاعت کی قدر کا نام ہے انسان کو برائی سے روکتی اور اچھائی کا خوگر بناتی ہے۔

تعلیم ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے سے انسانی زندگی کی تعمیر کی جاتی ہے۔ زندگی کی تعمیر میں بنیادی کردار اس مقصد کا ہوتا ہے جس کے لیے انسان کی تخلیق کی گئی۔ انسان کی تخلیق کا مقصد کیا ہے اس کے لیے ہمیں انسان کے خالق کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ انسانوں کا خالق جو اس پوری کائنات کا خالق ہے وہ ہمیں بتاتا ہے کہ انسان کو اللہ کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اس میں گورے کالے، مشرقی یا مغربی، افریقی یا ایشیائی، مسلمان یا عیسائی، یہودی یا

ہندو سکھ کی تخصیص نہیں ہے۔ یہ مقصد تخلیق سب انسانوں کے لیے ہے۔ اللہ کے نزدیک جو کہ خالقِ انسان اور خالقِ کائنات ہے سب انسان برابر ہیں۔ سب انسان ایک آدم کی اولاد ہیں اور سب کو اللہ کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے، قطع نظر اس کے کہ کوئی اللہ کو مانتا ہے یا نہیں اور اُسے مان کر اس کی عبادت کرتا ہے یا نہیں، انسان کا مقصد تخلیق یہی ہے اور مقصد تخلیق کے حصول کے لیے انسان کی تیاری تعلیم کا بنیادی مقصد ہے۔

یہاں ہم عبادت کی تھوڑی سی تشریح کرتے ہیں۔ عبادت سے مراد خالقِ انسان اور خالقِ کائنات کے احکامات اور اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنا ہے۔ خالق کائنات کے احکامات اور اس کی مرضی کیا ہے اس کا علم ہمیں اللہ یعنی خالق کائنات کے بھیجے گئے رسولوں کی تعلیمات سے ہوتا ہے۔ یہ تعلیمات وقتاً فوقتاً مختلف رسولوں کے ذریعے انسانوں تک پہنچتی رہی ہیں اور آخری بار نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ذریعے ہم تک پہنچیں۔ مقصد حیات یعنی عبادت پر کار بند ہونے کا نتیجہ آخرت میں جواب دہی میں کامیاب ہونا ہے۔ آخرت کی جواب دہی خالق انسان اور خالق کائنات نے اس لیے مقرر کی ہے کہ انسان اس دنیا میں آخرت کی جواب دہی کی وجہ سے اللہ کے احکامات پر عمل کرے اور اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارے۔

اب ہم واپس تعلیم کی طرف آتے ہیں۔ انسان کے مقصدِ تخلیق کے حصول کا ذریعہ یہ ہے کہ وہ ان احکامات پر عمل کرے جن کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ یہ احکامات دوسرے معنوں میں وہ اقدار (Values) ہیں جن کی ترویج خالق انسان اپنی مخلوق یعنی انسان میں چاہتا ہے۔ یہ اقدار اس نظام عقائد (Belief System) سے اخذ ہوتی ہیں جو نظامِ عقائد اللہ نے انسانوں کو اپنے رسولوں کے ذریعے عطا کیا ہے۔ اللہ کے دیے گئے نظامِ عقائد کے مطابق پوری کائنات، بشمول انسان، کا خالق، مالک اور رازق اللہ ہے۔ وہ بے مثل ہے، یکتا ہے اور اس کی ذات وصفات میں کوئی شریک نہیں۔ اُس نے انسانوں تک اپنی منشا پہنچانے کے لیے رسول بھیجے۔ اللہ کی اس منشا پر عمل عبادت ہے۔ انسانوں کو اللہ کے حضور جواب دہ بنانے کے لیے آخرت قائم ہوگی جہاں اللہ کی منشا پر چلنے والے انسان کامیاب قرار پائیں گے اور اللہ کی منشا کا انکار کرنے والے یا اللہ کی منشا کا حق ادا نہ کرنے والے ناکام گردانے جائیں گے۔

کامیاب لوگ انعام پائیں گے جو جنت کی شکل میں ہوگا اور ناکام لوگ سزا پائیں گے جو دوزخ کی شکل میں ہوگا۔

اوپر جو کچھ بیان ہوا اسے اگر ہم اقدار کی زبان میں بیان کریں تو اللہ کی ذات اور اللہ کی وحدانیت یعنی توحید ام الاقدار ہے۔ رسالت، آخرت اور عبادت اساسی اقدار ہیں جو ام الاقدار یعنی توحید کا بدیہی نتیجہ ہیں۔ ام الاقدار اور اساسی اقدار کے مطابق ذیلی اقدار یا وہ اقدار جن پر انسان کو انفرادی حیثیت میں، اجتماعی حیثیت میں اور پوری انسانیت کی سطح پر عمل کرنا چاہیے ان کا ماخذ قرآن وسنت ہے جس کا اظہار اسوۂ حسنہ سے ہوتا ہے۔ اسوۂ حسنہ جہاں خود ایک بنیادی قدر ہے وہاں یہ مطلوب اقدار اور ان اقدار پر عمل کا معیار اور میزان (Norm) بھی مہیا کرتا ہے۔

اسوۂ حسنہ جو انسانی اقدار کا ماخذ ہے، اس سے ہمیں جن انفرادی، معاشرتی، اجتماعی اور پورے بنی نوع انسان یعنی عالمی سطح کی جن اقدار کا علم ہوتا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

انفرادی سطح کی اقدار (Personal Values): آزادی، عزتِ نفس، ذمہ داری، فرض شناسی، راست بازی، طہارت، عاجزی، حیاء، امانت، دیانت، اعتبار، حب الوطنی، وعدہ ایفائی، جہاد، صلہ رحمی، تفکر، تدبر، تعقل، انفاق فی سبیل اللہ۔

معاشرتی یا اجتماعی سطح کی اقدار (Social Values): عدلِ اجتماعی، مواخات انسانی، برابری، تعاون، امن وسلامتی، احترام، مکالمہ، جہاد، آزادی اور تنوع کا احترام۔ انسانی حقوق، انفاق فی سبیل اللہ۔

بنی نوع انسان یا عالمی سطح کی اقدار (Global Values): وحدتِ انسانی، بین الاقوامی معاہدوں کا احترام، بین الاقوامی تعاون، طبعی ماحول کی حفاظت، آمد ورفت کی آزادی، حیاتیاتی اور نباتاتی زندگی کا تحفظ۔

اسلام میں کچھ وسیع البنیاد اقدار ہیں جنہیں آفاقی اقدار بھی کہا جاسکتا ہے۔ ان اقدار پر عمل پیرا ہونے سے پوری بنی نوع انسان رنگ، نسل، علاقہ، مذہب اور قومیت کی تمیز کے بغیر شامل ہوجاتی ہے حتیٰ کہ اس میں پوری کائنات کا احاطہ ہوجاتا ہے۔ یہ پانچ آفاقی اقدار یہ ہیں:

١۔ **حرمتِ جان:** اسلام میں انسانی جان کو کسی طرح بھی نقصان پہنچانا منع ہے۔ اس میں رنگ، نسل، علاقہ، مذہب کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ انسان بحیثیت انسان محترم ہے اور اس کی جان بحیثیت انسانی جان حرام ہے۔ اللہ ربّ العزت جو انسان کے خالق، مالک اور رازق ہیں فرماتے ہیں کہ اگر کسی ایک انسان کی جان لی گئی تو گویا پوری انسانیت کی جان لی گئی اور اگر ایک انسانی جان بچائی گئی تو گویا پوری انسانیت کی جان بچائی گئی۔

٢۔ **حرمتِ آبرو:** انسانی جان کی طرح انسانی عزت، وقار اور اس کی آبرو بھی محترم ہے اور کسی انسان کی آبرو پر ہاتھ ڈالنا اسلام میں حرام ہے۔ یہاں بھی رنگ نسل، قوم، مذہب اور علاقہ کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ تمام انسانوں کی آبرو اللہ کے نزدیک محترم ہے اور کسی بھی شخص کی آبرو کو نقصان پہنچانا حرام ہے۔

٣۔ **حرمتِ مال:** اسلام میں کسی کے مال پر ناحق قبضہ کرنا۔ کسی کو اپنے مال سے ناحق محروم کرنا، باطل طریقے سے مال کمانا، حرام مال کمانا اور حرام راستوں پر خرچ کرنا ممنوع ہے۔ وہ کسی کا ذاتی ہو، معاشرے کا اجتماعی مال ہو، اُسے ناحق قبضے میں لینا، ناحق استعمال کرنا حرام ہے۔ اس میں بھی کوئی تخصیص نہیں ہے۔

٤۔ **عقیدے کی حرمت:** عقیدہ ہر انسان کا ذاتی معاملہ ہے۔ اگرچہ صحیح عقیدہ رکھنا اللہ کے نزدیک ضروری ہے لیکن یہ انسان اور اللہ کا معاملہ ہے اور اس کی جواب دہی بھی اللہ ہی کرسکتا ہے۔ اللہ کے پیغمبروں کی بھی صرف یہ ڈیوٹی ہے کہ وہ صحیح عقیدہ انسانوں تک پہنچا دیں۔ قبول کرنا یا نہ کرنا انسان کا ذاتی فعل ہے جس کے لیے وہ اپنے اللہ کے سامنے جواب دہ

ہے۔ اس دنیا میں دین کے معاملے میں کوئی جبر کوئی اکراہ نہیں ہے۔ عقیدے کی بنیاد پر کسی خلاف کوئی امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ لوگوں کے ساتھ معاملہ حق و انصاف کی بنیاد پر کیا جائے گا نہ کہ عقیدے کی بنیاد پر۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانے میں اور خلفائے راشدین کے عہد میں اس کی متعدد روشن مثالیں موجود ہیں۔

۵۔ **حرمتِ ماحول:** اس پوری کائنات کی خالق، مالک اور چلانے والی اللہ کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو قائم رکھنے اور اسے بنی نوع انسان کے ساتھ دوسری تمام مخلوقات کے لیے مفید اور صحت مند رکھنے کے لیے اس میں توازن رکھا ہے۔ یہ توازن طبعی بھی ہے، کیمیائی بھی اور حیاتیاتی بھی ۔ ایسی سرگرمیاں اختیار کرنا جن سے اس کائنات کا طبعی ،کیمیائی، حیاتیاتی اور نباتاتی توازن خراب ہو اور اس کائنات کا ماحول انسانوں اور دیگر جانداروں کے صحت مند طریقے سے زندہ رہنے میں خلل پیدا کرے، وہ خالق کائنات کے سامنے ناپسندیدہ اور ممنوع ہے۔ چونکہ اس سے اللہ کی مخلوق کو نقصان ہوتا ہے اس لیے حرام ہے۔

مذکورہ بالا آفاقی اقدار پر عمل کا نتیجہ

جن آفاقی اقدار کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے ان پر عمل انسان کے لیے اور انسانی معاشرے کے لیے سراسر رحمت ہوگا۔ اس کا نتیجہ امن، انصاف، توازن اور کائناتی سلامتی کی شکل میں سامنے آئے گا۔ خاندان سے کمیونٹی، کمیونٹی سے قوم اور قوم سے عالمی زندگی تک خیر پھیلے گا اور شر ختم ہوگا۔

وہ معیارات (Norms) جو انسان کے قول وفعل سے جھلکنا چاہئیں

اقدار کی تعلیم جو ہمارے نصاب وتدریس کا حصہ ہونا چاہیے انسان کے رویوں میں قول وفعل کے معیارات (Norms) پیدا کرے گی اور جن کا مآخذ اسوۂ حسنہ ہے وہ یہ ہیں:

① **امن بمقابلہ فتنہ:** جن انفرادی، اجتماعی عالمی اور آفاقی اقدار کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے وہ اگر ہماری تعلیم وتدریس کا حصہ ہوں تو یہ زمین فتنوں سے پاک اور امن سے بھر جائے گی۔ مقامی سطح پر اگر وطن عزیز میں ہی اس پر پورا عمل ہو جائے تو پاکستانی قوم امن کی برکتوں سے

مالا مال ہو جائے گی۔

۲ **عدل بمقابلہ ظلم:** عدل اسلامی معاشرے کا طرۂ امتیاز ہے۔ ظلم کا استیصال صرف عدل سے ہی ہوسکتا ہے۔ امن کا قیام بھی عدل کے قیام سے مشروط ہے۔ اسلامی معاشرے میں عدل بلا تخصیص اور بلا امتیاز ہوتا ہے۔ اس میں غریب اور امیر، زیردست اور زبردست، حاکم اور محکوم، مسلم اور غیر مسلم کسی طرح کا امتیاز نہیں ہوتا۔

۳ **حلال بمقابلہ حرام:** اسلام میں ہر وہ چیز حرام ہے جو انسان کے ایمان، اس کی صحت، اس کی بہبود، انسانی امن اور انسانی فلاح کے لیے نقصان دہ ہو اور ہر وہ چیز حلال ہے جو انسان کے مفاد میں ہو بشرطیکہ اس سے کسی دوسرے کے مفاد پر زد نہ پڑتی ہو۔ اسلام حلال مال، حلال کمائی، حلال اشیاء کے استعمال کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور حرام مال، حرام کمائی اور حرام اشیاء کے استعمال کی ممانعت کرتا ہے۔ اسلام انسانوں میں حرام اور حلال کی تمیز پیدا کرنے کے ساتھ حرام اور حلال کے معاملے میں حساسیت پیدا کرتا ہے۔

۴ **معافی بمقابلہ انتقام:** اسلام میں معافی کی قدر کی بہت اہمیت ہے۔ اسلام میں یہ پسندیدہ ہے کہ بدلہ اور انتقام کی طاقت رکھنے کے باوجود وہ جس نے آپ سے زیادتی کی ہے اُسے معاف کردیا جائے۔ اللہ تعالیٰ اس سلسلہ میں حوصلہ افزائی کی خاطر فرماتا ہے کہ تم لوگوں کی خطائیں معاف کرو میں تمہاری خطائیں معاف کروں گا۔

۵ **محبت بمقابلہ بغض وعناد:** اسلا میں محنت ایک اعلیٰ قدر ہے۔ اللہ تعالیٰ انسانوں سے محبت کے اظہار کے طور پر کہتا ہے کہ ''میں انسان سے ۷۰ ماؤں کے برابر محبت کرتا ہوں''۔ محبت کرنا اللہ کی صفت ہے جو انسان کے لیے بھی مطلوب ہے۔ جہاں محبت کا جذبہ ہوگا وہاں بغض وعناد نہیں ہوگا اور اگر معاشرے میں بغض وعناد کی بجائے محبت عام ہو تو اس جذبے سے اور اس قدر کے اپنانے سے معاشرے میں امن وآشتی کو فروغ ملے گا۔

۶ **جذبۂ ایثار بمقابلہ خودغرضی:** اسلام خودغرضی کی بجائے جذبہ ایثار کو پسند کرتا ہے۔ سیرت طیبہ سے صحابہ کرامؓ کی زندگیوں اور اللہ کے نیک بندوں کی مثالوں سے ہمیں ایثار کا جذبہ خودغرضی کے جذبے پر فوقیت حاصل کرتا نظر آتا ہے۔

⑦ **قناعت بمقابلہ حرص:** اللہ نے جو کچھ عطا کیا ہے اس کا شکر ادا کرنا اور اُسی پر خوش رہنا قناعت ہے اور بے صبر ہو کر اِدھر اُدھر بھاگنا اور حلال وحرام کی تمیز کے بغیر زیادہ سے زیادہ قبضے میں لینا حرص ہے۔ سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ہمیں حرص کے مقابلے میں قناعت کا سبق ملتا ہے۔

⑧ **کفایت شعاری بمقابلہ اسراف وضیاع:** اسلام میں کفایت شعاری کی قدر کی بڑی اہمیت ہے۔ کفایت شعاری بخل نہیں بلکہ ضرورت کے مطابق خرچ اور اشیاء کا استعمال ہے۔ اسراف اور چیزوں کا ضیاع سخت ممنوع ہے۔ ایسی سرگرمیوں کی بھی ممانعت ہے جن سے ضیاع (Wastage) جنم لیتا ہو۔ اشیاء کی بچت اور وسائل کی بچت (Conservation) اسلام میں پسندیدہ عمل ہے۔

⑨ **یکساں سلوک بمقابلہ امتیازی سلوک:** اسلام میں ناحق امتیاز پسندیدہ نہیں ہے۔ سب کے ساتھ، ہر حالت میں اور تمام معاملات میں یکساں سلوک ایک پسندیدہ قدر ہے۔ بلا امتیاز رنگ ونسل، مذہب وعقیدہ اور قومیت سب سے کے ساتھ عادلانہ سلوک کی اسلام حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

⑩ **شورائیت بمقابلہ آمریت:** فیصلہ سازی اور معاملات کو چلانے میں اسلام مشاورت کا حکم دیتا ہے اور آمریت پر مبنی یک طرفہ فیصلوں کو ناپسند کرتا ہے۔ مشاورت اسلام کی ایک اعلیٰ قدر ہے جو معاشرے میں اگر رائج ہو تو معاملات میں بگاڑ پیدا نہیں ہوتا اور معاشرتی اتحاد اور استحکام اس سے جنم لیتا ہے۔ اجتماعیت میں شوارئیت رواج پاتی ہے۔

⑪ **عاجزی بمقابلہ تکبر:** اسلام عاجزی (Humility) کو پسند کرتا ہے اور تکبر کا استیصال کرتا ہے۔ اس سے معاشرے میں امن، اتحاد اور تعاون رواج پاتا ہے۔ آپس کی محبت بڑھتی ہے۔

⑫ **اجتہاد بمقابلہ جمود:** اسلام حالات اور ضروریات کے مطابق حکمت کے ساتھ مسائل حل کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔ جمود اسلام میں پسندیدہ رویہ نہیں ہے۔ قرآن وسنت کی تعلیمات کی روشنی میں نئے حالات میں مسائل کے مناسب حل پیش کرنا اسلام کی اعلیٰ قدر شمار

ہوتی ہے۔

⑬ **آفاقیت بمقابلہ قومیت اور مقامیت:** اسلام ایک آفاقی دین ہے۔ پوری عالم انسانیت کے لیے اور قیادت کے لیے ہے۔ اسلام کی مخاطب پوری انسانیت اور آدم کی پوری اولاد ہے۔ اس میں رنگ ونسل، علاقہ کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ اس لحاظ سے اسلام محدود قومیت، علاقائیت اور مقامیت سے بالاتر ہے۔ اس طرح اسلام ایک عالمی تہذیب، عالمی امن اور عالمی مفادات کا علم بردار ہے۔

⑭ **تدبر، تفکر، تعقل بمقابلہ اندھی تقلید:** قرآنِ حکیم نے تدبر، تفکر اور تعقل پر زور دیا ہے۔ انسان کو سوچنے سمجھنے پر اکسایا ہے۔ جدید زبان میں گویا تنقیدی سوچ (Critical Thinking) کو ایک قدر قرار دیا ہے۔

⑮ **رواداری اور برداشت بمقابلہ تعصب اور تنگ نظری:** اسلام میں رواداری اور برداشت ایک مثبت قدر ہے۔ اسلام تنوع (Diversity) اور اختلافِ رائے (Difference of Opinion) کو کھلے دل کے ساتھ قبول کرنے، برداشت کرنے اور رواداری کے ساتھ سنبھالنے کا سبق دیتا ہے۔ اس سلسلہ میں اسلام مناظرہ ومجادلہ کی بجائے افہام وتفہیم اور مکالمہ (Dialogue) کو رواج دیتا ہے۔ اختلاف کی بجائے مشترکات پر توجہ رکھ کر معاملات چلانے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

تعلیمی اداروں میں تعلیم اقدار (Values Education) کی اہمیت اور ضرورت

ہم معاشرے میں بے راہ روی، بدامنی، تعصب، عدم برداشت، نفرت اور تقسیم در تقسیم سے پریشان ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اسلام جن اقدار کی انسانوں میں اور انسانی معاشروں میں ترویج چاہتا ہے، وہ مفقود ہیں۔ جب تک یہ اقدار ہماری تعلیم وتربیت کا حصہ نہیں ہوں گی اور جب تک اسلام کی مطلوبہ اقدار اور ان اقدار کو اپنانے سے وہ معیاری رویے پیدا نہیں ہوں گے جن کا مآخذ قرآن وسنت کی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ ہے، اس وقت تک معاشرے میں خیر کا چلن نہیں ہوگا۔ یہ ایک تدریجی اور مسلسل عمل ہے جو تعلیمی اداروں اور تعلیم وتعلم کے دیگر ذرائع سے حاصل ہوگا۔

تعلیم اقدار (Values Education) کو کیسے یقینی بنایا جائے؟

اقدار کی تعلیم کو نصاب کا حصہ بنانا پڑے گا۔ نصاب محض کسی مضمون کے حقائق، تصورات، نظریات اور قوانین کے لوازمہ پر ہی مشتمل نہیں ہوتا بلکہ اقدار بھی اس کا حصہ ہوتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سطور بالا میں بیان کی گئی اعلیٰ اسلامی اور انسانی اقدار نصاب کے تانے بانے (Fabric) میں اس طرح سموئی جائیں جس طرح کہ خون جانداروں کے جسم کے ہر ہر حصہ میں دوڑ رہا ہوتا ہے اور قوت بخش زندگی عطا کرتا ہے۔ گویا اقدار کی تعلیم اور نصاب تعلیم میں اقدار کو سمونے کا عمل تعلیم کو ایک خوبصورت زندگی عطا کرنے والا عمل بنا دیتا ہے۔ اقدار نہ صرف نصاب تعلیم، درسی کتب اور روزمرہ کے اسباق کا حصہ ہوں گی بلکہ ان کی ترویج ہم نصابی سرگرمیوں کے ذریعے ہوگی جن میں مارننگ اسمبلی، بزمِ ادب، طلبہ کی انجمنیں، کھیل، تعلیمی سیر اور خصوصی تقریبات شامل ہیں۔ تربیت اساتذہ کے پروگراموں میں ان اقدار کو مرکزی اہمیت دی جائے۔ دوران ملازمت تربیتی کورسز میں بار بار یاددہانی کرائی جائے گی۔ تعلیمی انتظامیہ کو خصوصاً ان اقدار کا خوگر بنایا جائے گا۔ تعلیمی اداروں میں ان اقدار کی ترویج کے لیے خصوصی لیکچرز کا اہتمام کیا جائے گا۔ تعلیمی اداروں کی ان سرگرمیوں کو تقویت دینے کے لیے خطیب حضرات کو جمعہ کے خطبوں میں ان اقدار پر بات کرنے کی درخواست کی جائے گی۔ نیز ٹی وی چینلز کو بھی ان اقدار پر مبنی دلچسپ پروگرام نشر کرنے کی طرف توجہ دلائی جائے گی۔ تمام تعلیمی اداروں کو پابند کیا جائے گا کہ وہ مذکورہ اقدار کی تعلیم و ترویج بچوں کے والدین میں بھی کریں۔ اس مقصد کے لیے والدین کی تعلیم و تربیت کے پروگرام بھی جاری کیے جائیں گے۔ تعلیمی ادارہ معاشرے کا مرکز ہوتا ہے۔ اس طرح اسے حقیقی مرکز کا مقام دیتے ہوئے اگر مذکورہ اقدار کی تعلیم ہمہ جہتی لحاظ سے آگے بڑھائی جائے تو جہاں نئی نسل اعلیٰ اقدار کی روشنی میں پرورش پائے گی وہیں پورا معاشرہ اس خیر سے مستفید ہوگا۔

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر نویدہ کوثر

بچوں کو خود تعلیم دینے کا منفرد منصوبہ

الحمدللہ! میرے چاروں بچے ڈاکٹر اور انجینئر بن گئے ہیں اور اخلاق اور دین کے بھی اچھے ہیں۔ میرا طریقہ یہ تھا کہ میرے بچے سکول صرف امتحان دینے جاتے تھے۔ پروفیشنل ایجوکیشن سے پہلے کوئی بچہ سکول و کالج باقاعدہ نہیں گیا۔ سکول و کالج میں داخل کراتے وقت ان سے طے کر لیتی تھی کہ یہ سکول باقاعدہ نہیں آئیں گے، بلکہ صرف دسمبر ٹیسٹ اور سالانہ امتحان دیں گے۔ محمد عاقب علی ایم بی اے کرنے کے لیے ریگولر یونیورسٹی گیا۔ محمد عادل علی بی ایس سی ایس کرنے کے لیے، عزیر میڈیکل کالج میں داخلہ کے بعد اور محمد عمیر علی الیکٹریکل انجینئرنگ کرنے کے لیے۔ سب کا تعلیمی ریکارڈ شاندار رہے۔ پروفیشنل ایجوکیشن بھی عمدہ ہے۔

میں بچوں کے بارے میں کل بھی اس امر پر پکّی تھی کہ سکول کالج جائے بغیر بھی پڑھا جا سکتا ہے اور آج بھی۔ میرا سو فیصد یقین ہے کہ بچوں کی نیند، آرام اور صحت خراب کر کے ان کو بالکل فضول اداروں کے سپرد کیا جاتا ہے جو تربیت کے معاملے میں تو زیرو ہیں ہی، مگر تعلیم کے نام پر بھی آپ کا بچہ خاک نہیں سیکھتا۔

سات سال کے بچے کو پریپ تک آتے ہوئے تین سال لگتے ہیں۔ میری پوتی اپنی کلاس فیلوز سے دو سال چھوٹی ہے اور کلاس ون میں ہے۔ اور اب بھی ہمارے گھر میں اس کے ریگولر سکول جانے کی امید نہیں کہ بچے کو جو سکھانا بتانا ہے وہ اس کی ماں اور باپ کے ذمہ ہے۔

میرے بچوں کے استاد مجھ سے ہمیشہ پوچھتے کہ: ''آپ کے بچے اتنے زبردست تربیت یافتہ کیسے ہیں؟'' تو میں بتاتی کہ میں نے ان کو سکول و کالج کی رنگ برنگ صحبت سے فاصلہ پر رکھا اور تربیت میں اسلام اور علم حاصل کرنے کے اوصاف سے بچے اتنے لائق اور فرماں بردار ہیں۔

ہاں ایک بات یاد رکھنے کی اور ہے۔ مَیں مشکل مضامین کے لیے گھر آ کر پڑھانے والے استاد رکھتی تھی جن کا بچوں کی تربیت میں اور ان کے ڈھیروں نمبر لینے میں بہت ہاتھ

ہے۔ افتخار عافی صاحب، محمد طاہر صاحب، امیتاز صاحب وہ قابل صد احترام اساتذہ ہیں جن سے سب بچوں نے پڑھا اور آج تک وہ ہماری فیملی کا حصہ ہیں اور میری فیس بک میں شامل بھی۔

جو مائیں یہ سمجھتی ہیں کہ سکول کی عمارت کے اندر کوئی ایسی گیڈر سنگھی ہے جس سے بچے تربیت اور تعلیم دونوں حاصل کر لیں گے، وہ بالکل غلط ہیں۔ جو بچے آپ نے پیدا کیے ہیں، حضور والا وہ آپ کی ہی ذمہ داری ہیں۔ اسے کسی اور پہ مت ڈالیں۔

سیکولر نصاب بنانے پر امریکی شاباش

۲۸/اپریل بروز منگل تمام ٹی وی چینلز اور تمام اخبارات حکومتی پارٹی کے وائس چیئر مین اور وزیر خارجکہ جناب شاہ محمود قریشی کا بیان نشر اور شائع کر رہے تھے کہ یو ایس کمیشن برائے بین الاقوامی مذہبی آزادی نے جہاں بھارت میں اقلیتوں پر زیادتیوں کی مذمت کی ہے وہاں پاکستان میں مذہبی اقلیتوں کے ساتھ حسن سلوک کی تحسین کرتے ہوئے خصوصی طور پر سیکولر بنیادوں پر قومی نصاب تعلیم کی تدوین کی تعریف کی ہے۔ وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی نے امریکی آقایان ولی نعمت کے مقتدر کمیشن جو پہلے پاکستان کے نصاب اور درسی کتب پر تنقید کرتا رہا ہے اب نئے بننے والے سنگل نیشنل کریکولم کی سیکولر بنیادوں پر ترتیب وتدوین پر خوشی کے شادیانے بجائے ہیں۔ ہم کئی ماہ سے موجودہ حکومت کے یکساں قومی نصاب کو ہیومنزم اور سیکولرزم کی بنیادوں پر ترتیب دینے کے خلاف احتجاج کر رہے تھے جس کی یو ایس کمیشن برائے بین الاقوامی مذہبی آزادی نے کھلے عام تائید کر دی ہے اور جس پر وزیر اعظم کے بعد حکومت کی سب سے زیادہ با اثر شخصیت خوشی کے شادیانے بجا رہی ہے۔ بایں عقل و دانش بباید گریست۔

۳۰/اپریل ۲۰۲۰ء

ایک خط۔عمران احمد خان نیازی صاحب کے نام

جناب عمران خان صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

❁ آج سے تقریباً دس سال پہلے مَیں نے برادرم مجیب الرحمن شامی صاحب کے کہنے پر آپ کی کتاب 'مَیں اور میرا پاکستان' کا مطالعہ کیا تو یہ پڑھ کر حیرانی بھی ہوئی اور خوشی بھی کہ آپ دین کے بغیر زندگی گزار رہے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو توفیق بخشی، آپ نے دین کا مطالعہ کیا اور شعوری طور پر اسے قبول کیا اور آپ کی زندگی میں اس سے کئی مثبت تبدیلیاں آئیں۔

❁ آج کرونا وباء کی وجہ سے موت کا خوف ہر انسان کو سامنے نظر آ رہا ہے اور ہر مسلمان اللہ کی طرف رجوع کر رہا ہے، گڑگڑا کر اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہا ہے اور اس سے بخشش ورحمت کا طلب گار ہے۔ مَیں بھی حسب توفیق اللہ سے معافی مانگ رہا ہوں اور اللہ کی ناراضگی اور اس کے عذاب سے پناہ مانگ رہا ہوں۔ آپ بھی چونکہ میرے دینی بھائی ہیں لہٰذا میری خواہش ہے کہ آپ بھی اللہ کو راضی کریں اور اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لیں۔ البتہ آپ اور مجھ میں فرق یہ ہے کہ اللہ نے میرے گناہوں پر پردہ ڈالا ہوا ہے لیکن آپ چونکہ حکمران ہیں لہٰذا آپ کے اچھے اور بُرے کام سب کی نظروں میں ہیں۔ میرے علم کی حد تک جس حکومت کی آپ سربراہی کر رہے ہیں وہ تین ایسے بڑے گناہ کے کام کر رہی ہے جو اللہ تعالیٰ کو سخت ناراض کرنے والے ہیں۔

۱۔ سود لینا دینا جسے اللہ اور اس کے رسول نے اپنے خلاف اعلانِ جنگ قرار دیا ہے (البقرہ ۲:۲۷۹)

۲۔ آپ کے زیر انتظام میڈیا اور مخلوط تعلیم عریانی، فحاشی اور زنا کو فروغ دے رہے

ہیں جب کہ ایسا کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے آخرت کے ساتھ دنیا میں بھی عذاب دینے کا اعلان کر رکھا ہے۔(النور ۲۴:۱۹)

۳۔ قادیانیوں اور گستاخانِ رسول کی حمایت اور ناموس رسالت کے محافظوں کی مخالفت جس کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ اسے اپنے خلاف اعلانِ جنگ قرار دیتا ہے(صحیح بخاری حدیث:۶۵۰۲ ’مَن عادی لی ولیًّا فقد آذنتُه بالحرب..‘)

مجھے آپ کی عاقبت کے بارے میں بھی ڈر ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ آپ کے ان گناہوں کا وبال آپ کی رعایا پر پڑ رہا ہے اور مزید پڑے گا۔لہٰذا مَیں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ رات کی تنہائی میں اکیلے بیٹھ کر اپنا محاسبہ کریں اور ان کبیرہ گناہوں سے بچنے کی کوئی صورت نکالیں۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو دنیا وآخرت میں کامیابی سے نوازے اور جلد ان گناہوں سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔

والسلام،

آپ کا مخلص،

(ڈاکٹر محمد امین)
مدیر ماہنامہ البرہان، لاہور

کرونا　　　　ڈاکٹر محمد امین

کرونا، اسلام اور مغرب
غور کے بعض نئے پہلو

① کرونا خواہ اللہ کا عذاب ہے یا آزمائش یا سازش ہمیں اس سے بچنے کی ہر ممکن احتیاط کرنی چاہیے اور جو بیمار ہو اس کو پوری توجہ سے اس کا علاج کرانا چاہیے۔

② کرونا کا بیماری، تکلیف، مشکل، مشقت، مصیبت ہونا ظاہر ہے اور ایک مسلمان کو جب ایسی کیفیت کا سامنا ہو تو اس کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ اللہ کی طرف رجوع کرے، ذکر کرے، توبہ کرے، دعا کرے، تضرع اور زاری کا رویہ اختیار کرے اور اللہ سے گڑگڑا کر معافی مانگے۔

اور اتنا ہی کافی نہیں ہے۔ توبۃ النصوح کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی سابقہ معصیت پر ندامت کا اظہار کرے، آئندہ اس کے ارتکاب سے باز رہنے کا عہد کرے اور عملاً معصیت سے باز آ جائے اور اپنے رویوں کو اور اپنی عملی زندگی کو بدلے۔ لیکن معاف کیجیے گا ہم میں سے بہت سے لوگ ابھی تک معصیت سے باز نہیں آئے۔ کئی لوگ ذخیرہ اندوزی کر رہے ہیں، سمگلنگ اور گراں فروشی میں ملوث ہیں۔ میڈیا کے لوگ فحاشی اور عریانی عام کرنے میں ابھی تک مصروف ہیں۔ اخبارات سے پتہ چلتا ہے کہ معاشرے میں چوری، ڈاکہ، زنا حسب معمول جاری ہیں بلکہ ایک خبر ایک مسلمان پاکستانی باپ کی اپنی ۱۳ سالہ بیٹی سے بدفعلی کی بھی ہماری نظر سے گزری۔ ان حالات میں ہم کیسے توقع کریں کہ ہم سنجیدگی سے اللہ تعالیٰ کی نظر رحمت کے امیدوار ہیں۔

پھر یہ بات بھی نوٹ کرنے کی ہے کہ رجوع الی اللہ کا اظہار اور مطالبہ ہمارے علماء کی طرف سے تو ہو رہا ہے لیکن اس کا کوئی اظہار ہمارے سیاستدانوں اور حکمرانوں کی طرف سے نہیں ہو رہا۔ ہمارے وزیر اعظم صاحب کئی بار قوم سے خطاب کر چکے ہیں لیکن نہ تو کبھی خود انہوں نے توبہ و استغفار کا اظہار کیا اور نہ کبھی قوم کو اس کی تلقین کی۔ جس طرح توبہ کے وقت

ایک مسلمان کو ہر قسم کی معصیت سے توبہ کرنی چاہیے، اسی طرح ایک مسلمان وزیر اعظم کو ریاست کی سطح پر ہر قسم کی معصیت سے بچنے اور شریعت کے ہر حکم پر عمل کرنے اور اسے نافذ کرنے کا اعلان کرنا چاہیے۔ ہم کہتے ہیں کہ وزیر اعظم صاحب کو کم از کم بطور سمبل سود ختم کرنے کا اعلان کرنا چاہیے [1] اور آئین میں درج 'حدود اللہ' پر عمل کرنے کا اعلان کرنا چاہیے تا کہ زنا، فحاشی، شراب نوشی وغیرہ ختم ہو۔ اس لیے کہ سود تو اللہ و رسول کے خلاف اعلانِ جنگ ہے اور فحاشی پھیلانے والوں کو اللہ نے دنیا میں عذاب دینے کی دھمکی دی ہے اور زنا کی کثرت سے نئی اور اچانک بیماریوں کے پھیلنے کی احادیث موجود ہیں۔ تو معصیت کی ان صورتوں کو ختم کیے بغیر، ہماری توبہ کیا معنی رکھتی ہے اور ہم اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے کیسے بچ سکتے ہیں اور اس کی رحمت کے امیدوار کیسے ہو سکتے ہیں؟ کیا ہمارے عوام اور ہمارے حکمران ان باتوں پر سنجیدگی سے غور کر سکتے ہیں؟

③۔ رجوع الی اللہ کے نتیجے میں مسلمانوں کا رجحان قدرتی طور پر مسجدوں کی طرف بڑھ جاتا ہے (جیسا کہ رمضان المبارک میں ہوتا ہے) اور یہ بڑھنا چاہیے کیونکہ مساجد اللہ کا گھر ہیں، اس کی عبادت کی جگہیں ہیں لہٰذا اگر مشکل حالات میں مسلمانوں کا رجحان مساجد کی طرف زیادہ ہو تو یہ خوشی اور اطمینان کی بات ہے، اس کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔

لیکن یہ عجیب بات دیکھنے میں آئی ہے کہ اکثر مسلم حکمرانوں نے نہ صرف خود رجوع الیٰ اللہ کا مظاہرہ نہیں کیا اور نہ مسلمانوں کو اس کی ترغیب دی بلکہ الٹا مسجدوں کو احتیاط کے نام پر انہوں نے ویران کر دیا ہے یہاں تک کہ حرمین کو بھی، نہ صرف لاک ڈاؤن کا اعلان کر کے بلکہ کرفیو لگا کر بھی۔ اور مزید ستم یہ کہ انہوں نے اپنے اس اقدام کی تائید کے لیے علماء کی توثیق بھی حاصل کر لی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ رویہ غلط اور دینی لحاظ سے باعث ضرر ہے اور کرونا کے مقابلے کے حوالے سے بھی غیر مناسب ہے لہٰذا اس رویے اور اس کے حق میں دیے جانے والے دلائل کا تجزیہ ضروری ہے۔

---

[1] کافر ٹرمپ کا اعلان میڈیا میں موجود ہے کہ اُس کی حکومت سود زیرو پرسنٹ کرنے پر غور کر رہی ہے (یعنی سود کا خاتمہ) جب کہ عمران خاں کبھی آدھا پرسنٹ سود کم کرنے کا اعلان کرتے ہیں اور کبھی ایک پرسنٹ۔

اوّلاً: پاکستان سمیت اکثر مسلمان ملکوں کے حکمران مغربی اداروں (یا مغربیت سے متاثر اداروں) سے تعلیم یافتہ اوران کے تربیت یافتہ ہیں۔ ان کی اکثریت لبرل اور سیکولر ہے۔ وہ اسلام پر عمل کرنے اور مسلم معاشروں میں شریعت نافذ کرنے کے خلاف ہیں۔ ان کی اکثریت نے جبر سے یا پرامن حیلوں اور سازشوں سے دینی قوتوں کو دبا کر رکھا ہوا ہے۔ مسلم عوام اور مسلم حکمرانوں میں اکثر جگہ بُعد اور کشمکش کی صورت ہے۔ مسلم عوام بالعموم محب دین ہیں لیکن اکثر مسلم حکمران محب دین ہونے کی بجائے محب مغرب اور محب مغربی فکر وتہذیب ہیں۔

سعودی حکمرانوں کوکسی زمانے میں اس عموم سے استثنٰی حاصل تھا لیکن اس وقت سعودی عرب کی حالت اکثر مسلمان ملکوں سے بدتر ہے کیونکہ وہاں نئے مغرب زدہ حکمران کو مغربیت اور ماڈرن ازم قبول کرنے کا بخار نیا نیا چڑھا ہے لہٰذا اس کی لہر ابھی وہاں تیز ہے۔ اختلاف کرنے والے علماء کی بڑی تعداد جیلوں میں ہے۔ جو باہر ہیں وہ جان بچانے کے لیے حکمرانوں کی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور ہیں۔ عوام وخواص کی اس حکومت کی پالیسیوں سے ناراضگی کا ثبوت یہ ہے کہ وہاں کئی دفعہ بغاوت ہو چکی ہے۔

پاکستان میں تبلیغی جماعت کے افراد کی اس طرح پکڑ دھکڑ جاری ہے جیسے وہ مجرم ہوں اور سندھ حکومت مرکزی حکومت سے بھی زیادہ سختی مساجد پر کر رہی ہے بلکہ اس نے تو ان علماء کو گرفتار کر لیا جنھوں نے جمعہ پڑھانے کی جسارت کی اور جمعہ ۳/اپریل ۲۰۲۰ء کو اس نے ۱۲ بجے سے ۳ بجے تک یعنی نماز جمعہ کے لیے لوگوں کو گھروں سے نہ نکلنے دینے کے لیے مکمل لاک ڈاؤن کا حکم نامہ جاری کیا اور پولیس اور رینجرز کو ہر مسجد کے باہر کھڑا کر دیا کہ کوئی آدمی مسجد میں داخل نہ ہو۔ ظاہر ہے یہ دین مخالف رویہ ہے چنانچہ محب دین عوام نے پولیس کو بعض جگہ پیٹا اور جھگڑے ہوئے اور اگر سندھ حکومت باز نہ آئی تو عوام اور پولیس ورینجرز میں باقاعدہ جھڑپوں کا آغاز ہو جائے گا جو سول وار کی ابتداء ہوگی اور ملک وملت کے لیے ظاہر ہے سخت نقصان دہ ہوگی۔ یاد رہے کہ پیپلز پارٹی کی دین مخالف پالیسیوں کی وجہ سے اس کے بانی نے مقبولیت کھو دی تھی اور حکومت بھی گنوائی تھی لیکن یہ لوگ سبق سیکھنے کو تیار نہیں۔

ان حالات میں مسلم حکمرانوں کے مساجد بند کرنے کے فیصلے کو نہ معروضی طور پر اسلامی کہا جاسکتا ہے اور نہ متوازن۔

ثانیاً: رہی علماء کی بات تو سعودی عرب کے حالات کا ذکر ہو چکا۔ جامعہ ازہر طویل عرصے سے حکومتوں کے دباؤ میں ہے بلکہ حکومتی ادارہ بن چکی ہے اور اس کی آزاد اور باوقار علمی حیثیت ختم ہو چکی ہے۔ تقریباً یہی حال دیوبند کا ہے اور وہ اتنی آزاد علمی روش کا مظاہرہ بھی نہیں کر پا رہا جتنا بھارت کے دیگر ادارے اور جماعتیں کر رہی ہیں۔ پاکستان میں اسلامی نظریاتی کونسل اور اوقاف کے علماء کے علاوہ دینی مدارس کے قائدین کا رویہ بھی حکومت کے ساتھ مفاہمت وحمایت کا ہے۔ اور بہت سے معروف علماء کو لوگ اسٹیبلشمنٹ کا آدمی سمجھتے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی نوٹ کرنے کی ہے کہ کئی سکالرز اور علماء کی رائے ان حکومتی علماء اور اداروں کے برعکس بھی ہے لیکن ان آوازوں کو کوئی ابھرنے نہیں دیتا۔ نہ حکومتیں، نہ اسٹیبلشمنٹ، نہ مقامی اور بین الاقوامی میڈیا اور نہ مقامی وبین الاقوامی خفیہ ایجنسیاں۔ یہ بالکل ویسا ہی منظر ہے جو ممتاز قادری شہیدؒ کے وقت دیکھنے میں آیا تھا۔ لاہور میں کوئی امام سلیمان تاثیر کی نماز جنازہ پڑھانے کو تیار نہ تھا۔ جب شہید کا جنازہ پڑھایا گیا تو وہ راولپنڈی اسلام آباد کی تاریخ کا سب سے بڑا جنازہ تھا لیکن پاکستان کے سارے ٹی وی صرف حکومتی موقف پیش کر رہے تھے، دوسرا موقف سنانے اور دکھانے والا کوئی نہ تھا۔ بالکل یہی کیفیت اِس وقت مسجدوں اور حرمین کے ویران کرنے کی ہے کہ اس کے مخالف علماء کا موقف اور ان کے دلائل کھل کر سامنے آنے نہیں دیے جا رہے۔

مساجد کی ویرانی کے حوالے سے حکومتی موقف کی حمایت کرنے والے علماء کرام اور سکالرز سے ہم درخواست کریں گے کہ وہ اس بات پر غور فرمائیں کہ جب مغربی تہذیب کے بنیادی افکار (ہیومنزم، سیکولرزم، لبرل ازم وغیرہ) صریحاً خلاف اسلام ہیں اور وہ خدا کی خدائی کا انکار کرتے اور اس کی جگہ انسان کو دیتے ہیں اور اس تہذیب کے علمبردار مغربی ممالک کا اسلام اور مسلمانوں کا دشمن ہونا روز روشن کی طرح واضح ہے کہ پہلے انہوں نے مسلمانوں کو غلام بنایا، پھر پر امن سازشوں سے انہیں فکری وعملی غلام رکھنے کی جدوجہد کی اور پھر اسے موثر نہ سمجھ کر

عالم اسلام کے خلاف نئی صلیبی جنگ چھیڑ دی۔ وہ عراق، افغانستان اور لیبیا کو تباہ کر چکے۔ شام اور یمن اجڑ چکے اور پاکستان، ایران اور کئی دوسرے اسلامی ممالک پر شدید دباؤ جاری ہے۔ ان حالات میں صحیح الفکر علماء کرام اور سکالرز کے لیے جو طرز عمل مناسب ہے وہ یہ ہے کہ مغربی ممالک کی پالیسیوں اور مغربی پالیسیوں کو لے کر چلنے والے نااہل (بلکہ گماشتہ) مسلم حکمرانوں کے غیر مناسب مذہبی اقدامات کی مزاحمت کریں نہ کہ حمایت۔ ان اقدامات کی حمایت سے دین اور دینی مقاصد کو زک پہنچ رہی ہے اور دینی قوتیں مزید کمزور ہوں گی۔

ثالثاً: حکومت کا یہ موقف بودا ہے کہ مساجد میں نماز کی اجازت نہ دینے کی وجہ سماجی فاصلہ (Social Distancing) ہے۔ بطور ریکارڈ ہم حکومت پنجاب کے ۱۳ اپریل ۲۰۲۰ء کے آدھے صفحے کے اشتہار (نوائے وقت لاہور) کا حوالہ دینا چاہیں گے جس میں ۳۴ ایسے مواقع کی فہرست دی گئی ہے جن کو سماجی فاصلے کے اصول سے استثنیٰ دیا گیا ہے۔ ساری فہرست دینا تو باعث طوالت ہوگا لیکن ہم ان مواقع کی فہرست ضرور دینا چاہیں گے جہاں لوگ مل کر کام کرتے ہیں:

۱۔ صحت کی خدمات، اس سے منسلک افراد، ادویات اور PPEs بنانے والے اور ان کے ترسیل و فراہمی سے منسلک ادارے۔

۲۔ اہم مفاد عامہ کے ادارے مثلاً واپڈا، سوئی گیس، واسا، این ٹی ڈی سی، پوسٹل اور کوریئر سروسز، وغیرہ۔

۳۔ مالیاتی ادارے

۴۔ دفاع سے متعلق پیداواری ادارے، ضروری سٹاف کے ساتھ۔

۵۔ کھانے پینے کی اشیاء کے پیداواری ادارے اور ان کی ترسیل و فراہمی سے منسلک ادارے۔

۶۔ مویشی منڈی، غلہ منڈی اور سبزی منڈی۔

۷۔ ڈرائی پورٹ اور اس سے منسلک کسٹمز سروسز۔

۸۔ پولٹری ولائیوسٹاک فیڈ ملز اور اس کا سپلائی چین۔

۹۔ بیج بنانے والے، کھاد بنانے والے اور کیڑے مار ادویات بنانے والے ادارے اور ان کا سپلائی چین۔

۱۰۔ سکیورٹیز اینڈ ایکسچینج کمیشن، پاکستان سٹاک ایکسچینج، سنٹرل ڈیپازیٹری کمپنی اور منسلک ادارے۔

۱۱۔ باردانہ کے پیداواری ادارے اور اس کی ترسیل و فراہمی سے متعلق ادارے۔

۱۲۔ کھانے پینے کی پیکنگ/پیکیجنگ کی صنعت/کارخانے۔

۱۳۔ حفظانِ صحت کی اشیاء کی پیداوار اور اس سے منسلک فراہمی اور ترسیل کے ادارے۔

۱۴۔ تیل اور گیس کی پیداوار کے ادارے (ODGCL,PPL,MPCL) اور ان کے ٹھیکیداران وغیرہ۔

۱۵۔ پاک عرب ریفائنری، اس صنعت سے متعلقہ دیگر ادارے اور ان کی سپلائی چین۔

۱۶۔ احساس کفالت پروگرام اور بی آئی ایس پی کے دفاتر و مراکز۔

۱۷۔ ٹیلی کمیونیکیشن کمپنیز، ان کی دکانیں اور ان کے فرنچائزز۔

۱۸۔ ٹیٹرا پیک اور اس طرح کے دوسرے پیکیجنگ ادارے اور ان کی سپلائی چین۔

۱۹۔ پیٹرول پمپس، ایل پی جی کی دکانیں، فلنگ پلانٹس، آٹو ورکشاپس، آئل ڈپو، ٹائر پنکچر شاپس، ڈرائیور ہوٹلز اور سپیئر پارٹس کی دکانیں۔

۲۰۔ ٹریکٹر کی صنعت/کارخانے، ڈیلرز اور ٹریکٹر و زرعی آلات کی ورکشاپس۔

۲۱۔ سیمنٹ مینوفیکچرنگ پلانٹس اور سوڈا ایش انڈسٹریز سے متعلقہ تمام سرگرمیاں بشمول ان کی سپلائی چین۔

۲۲۔ ۱۰ بلین ٹری سونامی پروگرام سے متعلقہ محکمہ جنگلات کے تمام امور۔

۲۳۔ متعلقہ سرکاری دفاتر اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہلکار۔

۲۴۔ ہسپتال، میڈیکل سٹورز، لیبارٹریز اور فارماسوٹیکل کمپنیز اور ان کی سپلائی چین۔

۲۵۔ کارسینٹرز زیادہ سے زیادہ ۵۰ فیصد سٹاف کے ساتھ۔

۲۶۔ نہری پانی اور ڈیموں سے متعلقہ امور پر فائز محکمہ اریگیشن کے اہلکار۔

اس کے علاوہ آج ۱۴ اپریل ۲۰۲۰ء کو جب ہم یہ سطور قلم بند کر رہے ہیں حکومت پنجاب کا اعلان اخبارات میں شائع ہوا ہے کہ پنجاب میں تعمیرات، ٹیکسٹائل، سپورٹس، فارما، لیدر اور سرجیکل انڈسٹری کو کام کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ اور میڈیا میں بنکوں سے تنخواہیں اور پنشن وصول کرنے والوں اور راشن لینے والوں کے ہجوم کی تصاویر وائرل ہو رہی ہیں۔ اور آج ہی کے اخبارات میں ملی یکجہتی کونسل کے جنرل سیکرٹری جناب لیاقت بلوچ کا بیان شائع ہوا ہے کہ مساجد میں تالہ بندی ختم کی جائے کیونکہ کل لاہور میں نماز جمعہ کے وقت بہت سی مساجد کو تالے لگا دیے گئے تھے۔

سوال یہ ہے کہ جب حکومت خود ان ۲۶ مقامات اور دیگر مقامات اور فیکٹریوں پر لوگوں کو جمع ہونے اور اکٹھے ہو کر کام کرنے کی اجازت دے رہی ہے تو اس کو کیا تکلیف ہے کہ وہ لوگوں کو ضروری احتیاطی اقدامات کے ساتھ مساجد میں نماز ادا کرنے کی اجازت نہیں دے رہی؟ اس کا سبب اس کے سوا کیا ہے کہ جن ۲۶ مقامات پر حکومت لوگوں کو جمع ہونے اور مل کر کام کرنے کی اجازت دے رہی ہے وہ اس کے نزدیک اہم ہیں، ترجیحی ہیں لیکن مسجد میں باجماعت نماز ادا کرنے کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت اور ترجیح نہیں ہے۔ ایک مسلمان معاشرے میں یہ ظلم اور ناانصافی نہیں تو اور کیا ہے؟

ہمارا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ لوگوں کو بے محابا، بغیر احتیاط کے، مساجد میں آنے کی اجازت دی جائے۔ نہیں! انہیں بھی ساری احتیاطی تدابیر کرنے اور ان ساری پابندیوں کا پابند کیا جائے جو دوسروں پر عائد ہیں جیسے ماسک پہننا، دستانے پہننا، صابن سے ہاتھ دھونا اور ہاتھوں کو جراثیم کش دواؤں سے صاف کرنا وغیرہ۔ اگر حکومت اجازت دیتی تو ہر مسجد میں بآسانی اس کا اہتمام کر لیا جاتا اور یہ اہتمام اہل محلہ اور نمازی خود کر لیتے، اس میں حکومت کا ایک پیسہ بھی خرچ

نہ ہوتا۔ لیکن حکمرانوں اور ان کے مشیروں اور بیورکریسی کی ترجیح تو مساجد کو ویران کرنا ہے نہ کہ انہیں آباد کرنا۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ان مسجدوں کے بنانے، انہیں آباد کرنے اور آباد رکھنے میں ہماری حکومتوں کا کوئی کردار نہیں۔ مسلم معاشرہ یہ کام خود کر رہا ہے۔ حکومت اس میں کسی سطح پر کوئی معاونت نہیں کرتی حتیٰ کہ مساجد کے یوٹیلیٹی بل بھی کم یا معاف نہیں کرتی۔ جو حکومت مساجد کے آباد کرنے میں اتنی غیر متعلق (Irrelevant) ہے وہ ان کے ویران کرنے کی اتنی شائق اور اس پر مصر کیوں ہے؟ کورونا تو ایک بہانہ ہے۔ اگر کرونا کے باوجود ۲۶ قسم کے کارخانوں، مارکیٹوں، بنکوں، ہسپتالوں کو کام کرنے کی اجازت ہے تو ساری احتیاطوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مسجدوں میں نماز پڑھنے کی اجازت کیوں نہیں دی جاسکتی؟

④۔ بیماری میں اور وباؤں میں احتیاط کرنے کی اور علاج کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، ان سے ڈرنے اور لڑنے کی نہیں۔ کرونا کی صورت میں ڈر اور خوف میں اتنا مبالغے سے کام لیا گیا کہ یہ خوف و ہراس، افراتفری، تھرتھلی، اضطراب اور Panic میں تبدیل ہوگیا۔ سوال یہ ہے کہ کرونا وائرس سے خوف و ہراس کا یہ شدید ماحول کس نے پیدا کیا؟ اس میں زیادہ کردار میڈیا نے ادا کیا اور کر رہا ہے۔ کیوں؟ یہ بات معلوم و معروف ہے کہ ہمارا میڈیا اکثر و بیشتر مغربی حکومتوں اور ان کی خفیہ ایجنسیوں اور مقامی ایجنسیوں کی ہدایت پر اور ان کے دباؤ میں آکر کام کرتا ہے۔ وہ برائے نام آزاد ہے۔ یہ بات بھی معروف ہے اور حقائق پر مبنی ہے کہ امریکی و یورپی میڈیا یہودیوں کے ہاتھ میں ہے۔ (اس کی تفصیلات البرہان اگست ۲۰۱۹ء میں شائع کر چکا ہے)۔ معروف صحافی محمد اسلم خاں نے نوائے وقت (۲ اپریل ۲۰۲۰ء) میں اپنے کالم 'چوپال' میں اقوام متحدہ میں سابق پاکستانی سفیر حسین عبداللہ ہارون کا وہ بیانیہ شائع کر دیا ہے جس میں سابق سفیر نے نے حقائق اور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ کرونا وائرس اسرائیلی اور مغربی سازش ہے۔ چین، روس، ایران اور لاطینی امریکہ کے بہت سے ممالک کے قائدین یہی کہہ رہے ہیں۔ پاکستانی سینیٹر رحمان ملک نے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل سے اپیل کی ہے کہ وہ کرونا وائرس کے قدرتی یا لیب میڈ ہونے کے بارے میں طے کرنے کے لیے ایک اعلیٰ اختیاراتی کمیشن قائم کرے۔ زید حامد صاحب کا یہ بیان بھی سامنے رکھنا چاہیے کہ اس معاملے میں اسرائیل امریکہ کو بھی بائی پاس کر رہا ہے۔ اور یا مقبول جان نے

اپنے ۲۸ مارچ ۲۰۲۰ء کے کالم 'حرف راز' میں صحیح احادیث سے یہ ثابت کیا ہے کہ عالم اسلام میں مساجد اور حرمین کی بندش وہ آخری کڑی ٹوٹنے کی مظہر ہے جو یہودی سازش ہے اور یہودیوں کے نزدیک آمدِ مسیح ،گریٹر اسرائیل بلکہ ساری دنیا پر غلبے کا استعارہ ہے (جسے مسلمان مسیح دجال کہتے ہیں)۔ خلاصہ یہ کہ میڈیا نے جو ہائپ کری ایٹ کر رکھی ہے۔ ڈر، خوف، ہراس اور Panic کا جو ماحول تخلیق کر رکھا ہے وہ مصنوعی ہے اور اس کی پشت پر خفیہ یہودی ہاتھ ہے۔

مسلمانوں کا رویہ اس طرح کے معاملات میں کیا ہونا چاہیے؟ قرآن کہتا ہے کہ اے مسلمانو! مشکل کا وقت آئے تو نماز اور صبر سے کام لو۔ کیا ہم کرونا کے سلسلے میں صبر سے کام لے رہے ہیں اور کیا ہم نماز سے کام لے رہے ہیں؟ ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ کا اسوۂ مبارک یہ تھا کہ جب بھی کوئی پریشانی ہوتی، کوئی بری خبر آتی، آپ مصلیٰ بچھا لیتے۔ اللہ کی طرف یہ رجوع انسان میں صبر اور حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ اور وہ ہراس، اضطراب اور Panic سے بچا رہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ کوئی بھی تکلیف اللہ کی مشیت اور حکم کے بغیر نہیں آتی۔ لہٰذا اللہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے کہ جس نے تکلیف بھیجی ہے، وہی اس کا تدارک کرے اور وہی اسے برداشت کرنے کی قوت دے۔

لیکن ہمارا رویہ کیا ہے؟ یہ کہ کرونا نے ہم میں خوف و ہراس پیدا کر دیا ہے۔ اس نے اضطراب اور Panic پیدا کر دی ہے بلکہ اس میں اتنا مبالغہ کر دیا ہے کہ کرونا کا خوف خدا کے خوف اور خدا کی تعلیمات پر غالب آ گیا ہے۔ ہمارے ایک عزیز کا بیٹا نیک اور دیندار ہے، والدین کا فرمانبردار اور خدمت گزار ہے۔ وہ والدین کے گھر سے سات آٹھ میل دور الگ گھر میں رہتا ہے۔ اس کی دو بیویاں ہیں۔ دونوں گھر اکٹھے بنے ہوئے ہیں۔ درمیان میں ایک دیوار ہے جس پر سیڑھی بنی ہوئی ہے اسے کرونا کا اتنا خوف اور وہم ہو گیا ہے کہ اس نے ایک گھر کے بچوں کو دوسرے گھر میں جانے سے منع کر دیا ہے۔ اس نے اپنی ماں کو فون کر کے کہا کہ اپنے گھر میں ٹِک کر بیٹھیں، کسی قیمت پر گھر سے نہ نکلیں، میرے گھر بھی نہ آئیں۔ کرونا سے احتیاط ضروری ہے لیکن یہ رویہ ظاہر ہے احتیاط سے بڑھ کر خوف و ہراس اور وہم بن چکا ہے۔ یہ رویہ اسلامی قدروں کے صریحاً خلاف ہے بلکہ اس میں کرونا کا خوف خدا کے خوف پر

غالب آ گیا ہے جو دین کی توہین اور شرک کے مترادف ہے۔

⑤۔ اس مسئلے کا ایک پہلو صحت کا بھی ہے۔ کرونا ایک فلو ہے جو صحت مند لوگوں کے لیے بالعموم مہلک نہیں ہے البتہ کمزور قوت مدافعت (Weak Immunity) کے حامل لوگ بچے، بوڑھے اور جو دوسری بیماریوں میں مبتلا ہوں، وہ اس کا آسان شکار ثابت ہوتے ہیں۔ اب قوت مدافعت کا تعلق صرف جسمانی صحت سے نہیں ہوتا، اس کا گہرا تعلق نفسیاتی اور ایمانی صحت سے بھی ہوتا ہے۔ اگر ایک شخص کا ایمان مضبوط ہو، اللہ پر اس کا یقین پختہ ہو، وہ توکل اور قناعت کا خوگر ہو تو وہ یقیناً خوشگوار، پرسکون اور مطمئن زندگی گزارے گا۔ اس کی قوت مدافعت بھی مضبوط ہوگی اور اس کے کرونا میں مبتلا ہونے کے امکانات بھی کم ہوں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بہتر قوت مدافعت کے لیے اور بہتر نفسیاتی صحت کے لیے رجوع الی اللہ، مساجد میں عبادت اور اللہ سے لو لگانا مفید ہے اور مساجد میں جانے پر پابندی ایک مسلمان کی جسمانی و نفسی صحت کے لیے نقصان دہ ہے کیونکہ یہ ایک مسلمان کی عمر بھر کی مذہبی پریکٹس وعادت کے خلاف ہے، یہ اس کے اندر کشمکش، تناؤ، قلق، سٹریس، اور فرسٹریشن کو جنم دیتی ہے جو اس کی صحت اور قوت مدافعت کے لیے نقصان دہ ہے اور یہ بات کرونا کے حق میں جاتی ہے۔

⑥۔ آخری بات یہ کہ ہم اہل علم و دانش کو متوجہ کرتے ہیں، خصوصاً انہیں جو اچھی انگریزی لکھ سکتے ہیں کہ وہ دنیا خصوصاً اہل مغرب کو اس طرف متوجہ کریں کہ کیا وجہ ہے کہ تعلیمی، معاشی، سیاسی ہر سطح پر پسماندگی اور سائنس و ٹیکنالوجی میں پیچھے ہونے کے باوجود مسلم دنیا کے اکثر خطے (باستثنیٰ ایران) کرونا سے بہت کم متاثر ہوئے ہیں اور مغرب ہر لحاظ سے ترقی یافتہ ہونے اور سائنس و ٹیکنالوجی میں آگے ہونے کے باوجود کرونا کے ہاتھوں زیادہ نقصان اٹھا رہا ہے؟ ان کو توجہ دلانے کی ضرورت ہے کہ مذہب اور اللہ میں یقین آج بھی ایک برتر قوت ہے لہٰذا وہ اپنے طرز فکر اور نظام حیات پر از سرِ نو غور کریں اور اس پر نظر ثانی کریں۔ جس طرح علامہ اقبالؒ نے "Is Religion Possible?" کی بحث چھیڑی تھی، آج اہل مغرب کو بتانا چاہیے کہ "Religion is the Only Solution" لہٰذا وہ مذہب کی طرف رجوع کریں خصوصاً مذہب کے اس تصور کی طرف کہ یہ ساری زندگی کے لیے ہدایت ہے، صرف مابعد الطبیعیات کا مسئلہ نہیں۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العلمین۔

کرونا ڈاکٹر محمد امین

مولانا طارق جمیل صاحب کا آدھا سچ

سیکولر اور لبرل صحافیوں اور مفاد پرست سیاستدانوں کی مولانا پر تنقید بے جا ہے

کرونا کے حوالے سے فنڈ ریزنگ کے لیے وزیر اعظم عمران خان صاحب نے اہم ٹی وی چینلز کے ساتھ مل کر ٹیلی تھون کیا، اس کے آخر میں مولانا طارق جمیل صاحب نے جو تقریر نما دعا کرائی اس کے اہم نکات اس وقت میڈیا میں اور اس کے علاوہ بھی پاکستان میں آج کل زیر بحث ہیں۔ ہم بھی اس سلسلے میں کچھ گزارشات پیش کرنا چاہتے ہیں۔

مولانا طارق جمیل صاحب کا سچ

مولانا صاحب نے ایک حدیث رسول بیان فرمائی اور اس کی تشریح کی۔ صادق ومصدوق پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام نے جو فرمایا وہ سو فیصد صحیح ہے کہ جو قوم جھوٹ بولے، بد دیانتی سے کام لے، بد اخلاق ہو اور حرام کھاتی ہو وہ گویا ساری حسنات سے اور اللہ تعالیٰ کی نصرت وتائید سے محروم ہے۔ اور جو قوم سچ بولے، دیانت دار ہو، خوش اخلاق ہو اور رزق حلال کماتی ہو وہ گویا سارے حسنات کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اور اسے اللہ تعالیٰ کی نصرت کی امید رکھنی چاہیے۔

مولانا نے اس کا اطلاق بھی صحیح کیا کہ ہم پاکستانی مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت ان اخلاقی بیماریوں میں مبتلا ہے۔ ان پر جو بزرجمہر اس ضمن میں اعتراض کر رہے ہیں کہ یہ فرقہ ملامتیہ والا رویہ ہے، پوری قوم کو من حیث القوم جھوٹا کہنا اسے دنیا میں رسوا کرنا ہے اور مایوسی کی علامت ہے وغیرہ وغیرہ۔ ہم ان ناقدین کے اعتراضات کو بلا جواز سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بنیادی انسانی صفات ہیں جو ہر انسان میں اور ہر مسلمان میں لازماً ہونی چاہئیں اور جس قوم/تہذیب میں یہ نہ ہوں، اس کا زوال پذیر ہو جانا لابدی ہے۔ اسلام پر صحیح طریقے سے عمل کرنے پر یہ خوبیاں صدر اوّل کے مسلمانوں میں پیدا ہو گئی تھیں اور اسی لیے وہ اسلام کو چار دانگ عالم میں پھیلانے میں کامیاب ہو گئے تھے اور جن قوموں میں یہ خوبیاں نہ تھیں، ان پر

دینی ،فکری، علمی اور سیاسی غلبہ انہیں حاصل ہوگیا تھا۔ اور آج اگر ہم مسلمان دنیا میں ذلیل ورسوا ہورہے ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ہمارا نظام تعلیم وتزکیہ اور دعوت واصلاح ناقص اور بوسیدہ ہوگیا ہے جس کی وجہ سے ہمارا ایمان کمزور اور مسلم شخصیت ناتواں ہوگئی ہے اور ہم میں یہ خوبیاں ناپید ہوگئی ہیں۔ لہٰذا مولانا کے بیان کا یہ حصہ صحیح ہے اور ہم اس کی تائید کرتے ہیں۔ اس ضمن میں بہتر رویہ یہ ہے کہ اس پر سیخ پا ہونے کی بجائے افرادِ قوم میں یہ خوبیاں پیدا کرنے کی فکر کی جائے۔

مولانا کی تقریر کا وہ حصہ بھی صحیح ہے جس میں انہوں نے سیاستدانوں، میڈیا اور عدالتوں کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے کہ ان میں یہ اخلاقی برائیاں موجود ہیں اور ان کی اصلاح کی فکر کی جانی چاہیے۔ بلاشبہ ہمارے حکمرانوں اور سیاستدانوں کی اکثریت کرپٹ ہے، جھوٹ بولتی ہے۔ میڈیا والے بھی اکثر جھوٹ بولتے ہیں بایں معنی کہ جھوٹ کو گلمیرائز کرکے پیش کرتے ہیں اور خبروں وتبصروں کو Tilt کرکے مخصوص زاویہ دیتے ہیں۔ جھوٹ کے علاوہ ہمارے میڈیا کا بڑا جرم یہ ہے کہ وہ ہمارے معاشرے میں عریانی، فحاشی اور زنا پھیلانے میں ملوث ہے اور ہمارے خاندانی نظام اور اسلامی معاشرت کی جڑیں کاٹ رہا ہے (مولانا اس کا ذکر کرنا بھول گئے)۔ ہماری عدالتیں اسلامی نظامِ عدل کے اصولوں کے مطابق کام نہیں کررہیں.... یہ ساری باتیں صحیح ہیں۔ ان پر سیخ پا ہونے کی بجائے ریاست کے ان بنیادی اداروں (انتظامیہ، عدلیہ، میڈیا) کی اصلاح کی فکر کرنی چاہیے۔ اس اصلاح کے منہج اور طریق کار کی تفصیلات پر گفتگو ہونی چاہیے نہ کہ اس کی مذمت اور مزاحمت کرنی چاہیے۔

وہ سچ جو مولانا نہیں بول سکے

مولانا نے اخلاقی برائیوں کی صحیح نشاندہی کی لیکن ان کے اسباب وعلاج پر گفتگو نہیں کی۔ ظاہر ہے وہ اس موضوع پر کوئی تحقیقی مقالہ پیش نہیں کررہے تھے لیکن اس کے باوجود ہم سمجھتے ہیں کہ وہ تفصیل کے ساتھ نہ سہی اختصار کے ساتھ اور موثر انداز میں ان کا ذکر کرسکتے تھے۔

ہماری یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ کسی قوم کی خرابیوں کی ذمہ دار اس کی مذہبی وسیاسی قیادت ہوتی ہے۔ مسلمانوں میں مذہبی قیادت کا کردار زیادہ بنیادی اور پائیدار ہوتا ہے کیونکہ

حکمران عارضی ہوتے ہیں، آتے جاتے رہتے ہیں جبکہ علماء کرام اور دینی قیادت ہمیشہ کام کر رہی ہوتی ہے لہٰذا مولانا طارق جمیل صاحب کو سوچنا چاہیے.... اور اگر پہلے نہیں سوچا تو اب سوچنا چاہیے.... کہ ہماری اصلاحی ودعوتی جماعتوں، ہمارے دینی مدارس اور ہماری دینی سیاسی تحریکوں کے کام میں کیا خرابیاں اور نقائص ہیں کہ وہ قوم کی موثر دینی واخلاقی تربیت نہیں کر پا رہیں؟ اور اس پر غور ہونا چاہیے کہ وہ کیوں ایسا نہیں کر پا رہیں اور یہ کام کیسے موثر انداز میں کیا جا سکتا ہے؟ ظاہر ہے اس کے لیے مولانا کو اپنی دینی قیادت پر تنقید کرنا پڑتی جو انہوں نے نہیں کی، حالانکہ اگر کرتے تو بہتر ہوتا۔

ان کی تقریر کا دوسرا بڑا نکتہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ سیاسی حکمرانوں کو بالخصوص وزیر اعظم عمران خان صاحب کو، جو ان کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے، مخاطب کرتے اور ان کی ذمہ داریاں ان کو یاد دلاتے کہ:

- قوم اور ریاست کے اداروں میں جو مذکورہ اخلاقی بیماریاں پیدا ہو گئی ہیں، ان کی اصلاح کرنا خصوصاً تعلیم وتربیت کے نظام کو درست کرنا تا کہ تعمیر سیرت کا کام صحیح اسلامی خطوط پر ہونے لگے، یہ وزیر اعظم کی ذاتی، اخلاقی اور قانونی ذمہ داری ہے۔

- میڈیا جو فحاشی، عریانی اور زنا پھیلا رہا ہے، اس کے ذمہ دار بھی وزیر اعظم ہیں، وہ کیوں اس کی اصلاح نہیں کرتے؟

- کرپشن کے ساتھ رزق حرام کا سب سے بڑا ذریعہ سود ہے، وزیر اعظم صاحب کیوں اس کے تدارک کی کوشش نہیں کرتے؟

اگرچہ مملکت خداداد پاکستان کے ہر شعبے میں شریعت نافذ ہونی چاہیے اور وزیر اعظم صاحب اس کے لیے اللہ کے حضور جوابدہ ہوں گے لیکن چلیے ابتداء کے لیے وہ مذکورہ بالا چند بنیادی امور کو ہی پہلے لے لیں۔

ہم کہتے ہیں کہ مولانا طارق جمیل صاحب عوام، میڈیا اور عدالتوں پر تنقید کرنے کے ساتھ اگر وزیر اعظم پر بھی، طریقے سلیقے سے، تنقید کرتے تو یہ زیادہ مناسب ہوتا۔ اگرچہ شہرت کسی مخلص مسلمان کے پیش نظر نہیں ہوتی۔ لیکن اگر مولانا طارق جمیل صاحب دوسروں کے

ساتھ وزیراعظم صاحب پر بھی تنقید کرتے تو ہماری رائے میں لوگ مولانا کی زیادہ تعریف کرتے، ان کی حق گوئی کو سراہتے اور بعید نہیں کہ ان کی نصیحت کا اثر بھی ہوتا کیونکہ دل تو اللہ تعالیٰ کی مٹھی میں ہوتے ہیں، وہ جب چاہے کسی کو اصلاح کی توفیق عطا فرما دیتا ہے۔

ہم ان لوگوں کی تنقید کو بھی غلط سمجھتے ہیں جو مولانا صاحب پر اعتراض کرتے ہیں کہ وہ حکمرانوں کے پاس کیوں جاتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ ہمارے علماء کرام اور ہماری دینی اصلاحی دعوتی جماعتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ عوام کے ساتھ ساتھ خواص کی بھی دینی تعلیم وتربیت کا اہتمام کریں۔ ظاہر ہے کہ انہیں اس کے لیے ان کے پاس جانا ہوگا۔ لہٰذا اگر یہ جانا دین کی خاطر ہو، حکمرانوں کی اصلاح کی خاطر ہو، ان کو حق کی نصیحت کرنا مقصود ہو (ذاتی یا جماعتی مفاد اٹھانا پیش نظر نہ ہو) تو یہ محمود ہے۔ یہ کرنے کا کام ہے اور اگر کوئی دوسرا یہ کام نہیں کر رہا اور مولانا طارق جمیل صاحب کر رہے ہیں تو یہ ان کا صحیح قدم ہے، یہ تبلیغ کا وہ فرض کفایہ ہے جو وہ ساری دینی قیادت کی طرف سے ادا کر رہے ہیں۔ ہاں! انہیں ذرا جرأت ایمانی سے کام لینا چاہیے اور اسلاف کی طرح حکمرانوں کو خلاف شریعت امور پر سرعام ٹوک دینا چاہیے۔ اس میں دین کی بھی عزت ہے اور علماء دین کی بھی۔ ہمیں اُمید ہے کہ وہ ہماری ان گزارشات پر غور فرمائیں گے تاکہ اگر دوبارہ کبھی ان کو موقع ملے تو وہ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

کرونا مدیر

مساجد کی بندش۔پیپلز پارٹی کی سندھ حکومت کا سفاکانہ رویہ

ملک کے سیکولر اور لبرل طبقے کو بہانہ مل گیا ہے کہ کرونا کا شور مچا کر مسجدیں بند کرنے کی حمایت کریں۔ یہ حلقے فرقہ واریت کا شور مچا کر پہلے مسجدوں کو نیشنلائز کرنے کی باتیں کرتے رہے ہیں۔ سندھ میں اس وقت پیپلز پارٹی کی حکومت ہے اور اس پارٹی کا مزاج بلاشک وشبہ سیکولر اور لبرل ہے اور سندھ کے حکمران پاکستان میں اسلامی اقدار اور اسلامی شعائر سے زیادہ مغرب کے سیکولر و لبرل نظریات کے غلبہ کے خواہاں اور اس کے لیے کوشاں ہیں۔

تحریک انصاف کی مرکزی حکومت بھی سیکولر اور لبرل ہی ہے تاہم سندھ سیاسی وجوہ کی بناء پر کرونا اور اس کے اثرات سے نمٹنے کے حوالے سے مرکز سے آگے رہنا چاہتا ہے۔عمران خان ابھی لاک ڈاؤن کے حوالے سے متذبذب تھے کہ سندھ حکومت نے لاک ڈاؤن کا اعلان کردیا۔مرکز نے علماء کرام کے ساتھ مل کر احتیاطی تدابیر استعمال کرتے ہوئے مساجد کھولنے اور فرض نمازیں اور تراویح پڑھنے کی اجازت دی۔لیکن جس دن صبح رمضان تھا،رات سندھ حکومت نے سہ پہر ۵ بجے سے لے کر صبح ۸ بجے تک سخت لاک ڈاؤن کا حکم دے دیا۔ مطلب یہ کہ روزہ دار فرض نمازیں اور تراویح کی نماز مسجد میں نہ پڑھ سکیں۔

اس سے پہلے سندھ حکومت مساجد میں جمعہ کی ادائیگی پر سختی کرتی رہی ہے۔ وہ مساجد کے باہر پولیس کھڑی کر دیتی ہے تاکہ کوئی آدمی مسجد میں نماز پڑھنے نہ جائے۔ اس پر دو جگہ پولیس کے ساتھ مارکٹائی تک نوبت پہنچی اور مساجد کے علماء کرام کو پکڑ کر جیل میں ڈال دیا گیا۔ لہٰذا سندھ حکوت کا تازہ فیصلہ غلط ہی نہیں خطرناک اور ناعاقبت اندیشانہ بھی ہے۔ اگر خدانخواستہ عوام اور پولیس میں جھڑپیں شروع ہوگئیں تو سیکورٹی کا مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔

یادرہے کہ پیپلز پارٹی کے غیر اسلامی اقدامات کی وجہ سے اس کے بانی کی اور جماعت کی مقبولیت ختم ہوگئی تھی،عوام اور دینی حلقوں نے ان کے خلاف کامیاب عوامی تحریک چلائی اور ان کی حکومت بھی جاتی رہی۔ اس کے باوجود پیپلز پارٹی کی موجودہ سندھ حکومت عقل کے ناخن نہیں لے رہی اور اس نے غالباً اپنے ماضی سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔

فہم دین

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

غامدی متجددین کا باغیانہ رویہ

ایک دوست نے سوال کیا کہ روایتی اور غامدی بیانیے کا فرق علمی اور اصولی نہیں بلکہ عام فہم انداز میں بیان کر دیں کہ سب کو سمجھ آ جائے۔ مَیں نے کہا! بھائی میرے نزدیک روایتی (Traditionalist) اور غامدی (Modernist) بیانیے کا فرق وہی ہے جو گناہ اور بغاوت کا فرق ہے۔'' اس نے کہا کہ مزید کچھ کھول کر بیان کریں۔

مَیں نے کہا کہ آدم علیہ السلام سے خطا ہوئی، انہوں نے اپنی خطا پر شرمندگی محسوس کی، توبہ استغفار کی، یہ آدمیت کا بیانیہ ہے۔ آدمیت یہ نہیں ہے کہ گناہ نہیں ہوگا اور معاشرہ معصوم بن جائے گا، بلکہ آدمیت یہ ہے کہ گناہ ہوگا لیکن معاشرہ توبہ استغفار کے حال کے ذریعے اس گناہ کو بھی اپنے پروردگار کا قرب حاصل کرنے کے لیے سیڑھی بنا لے گا۔

اور شیطنت یہ ہے کہ خطا ہو اور وہ خطا کو جسٹی فائی کرنا شروع کر دے۔ آدمیت اور شیطنت دو رویے ہیں: ایک گناہ کر کے شرمندگی کے اظہار کا رویہ ہے اور دوسرا گناہ کر کے اسے جسٹی فائی کرنے کا رویہ ہے۔ ایک اپنے مالک کا گناہ گار ہے اور دوسرا اپنے مالک کا باغی ہے۔ ایک اپنے آپ کو مالک کا گناہ گار کہہ کر اس کے حضور میں توبہ و استغفار کے حال میں ہے اور دوسرا مالک کو یہ سمجھانے کی پوزیشن لیے ہوئے ہے کہ تیرے کلام کا مطلب وہ ہے، جو مَیں تمہیں سمجھا رہا ہوں۔

مولوی سے بھی گناہ ہو جاتے ہیں، وہ معصوم نہیں ہیں۔ مولوی فلم دیکھ لے گا تو اپنے آپ کو گناہ گار سمجھے گا۔ وہ داڑھی نہ رکھے گا تو دل میں شرمندگی کا احساس ہوگا۔ وہ میوزک سنتا ہوگا لیکن اس کے جائز ہونے کی دلیلیں نہیں گھڑے گا۔ وہ حالات کے جبر کے تحت کسی عورت سے ہاتھ بھی ملا لے گا لیکن بعد میں توبہ استغفار کرے گا کہ یہ انسانوں کا معاشرہ ہے، فرشتے نہیں ہیں کہ ان کے ربّ نے انہیں حالات کے جبر کے تحت شرک کرنے اور حرام کھانے کی رخصت بھی دے دی ہے لیکن شرک اور حرام کو جائز کرنے کی نہیں۔ تو مولوی معاشرے کے ساتھ یوں

زندگی گزارتا ہے یعنی توبہ اور استغفار کے حال کے ساتھ۔

لیکن اس ماڈرن فکر کی نحوست یہ ہے کہ اس نے اس معاشرے سے توبہ اور استغفار کا حال چھین لیا ہے۔ اب آپ نے بینک سے سود لیا، انہوں نے اسے جائز قرار دے دیا۔ آپ نے لڑکی سے ہاتھ ملا لیا، انہوں نے اس کی دلیل نکال لی۔ آپ نے مووی دیکھ لی، انہوں نے اسے جواز بخش دیا۔ آپ نے میوزک سننے کو عادت بنا لیا، انہوں نے کہا کہ یہ فطرت انسانی ہے۔ آپ نے ریاست سے مذہب کو علیحدہ کر دیا، انہوں نے کہا: بالکل ٹھیک کیا، ریاست کا مذہب سے تعلق ہی کیا ہے؟

اور وہ دن دور نہیں کہ انہیں اپنی زندگیوں میں توبہ واستغفار کے لیے گناہ ڈھونڈنا پڑے گا لیکن نہیں ملے گا۔ کیوں؟ کیونکہ وہ اس کے جواز کی دلیل نکال چکے ہوں گے۔ تو تعبیر دین کا فرق ایک طرف، سچ بتائیں، کہ لوگ جن کاموں کو گناہ سمجھ کر کرتے تھے اور اس پر اللہ کے حضور میں توبہ واستغفار کرتے تھے، آج لوگ انہی کاموں کو مباح اور جائز سمجھ کر کریں گے تو معاشرے سے انہوں نے توبہ اور استغفار کا حال نہیں چھین لیا تو اور کیا کیا؟ کیا اپنے ہر الٹے سیدھے عمل کی جسٹی فی کیشن دینے کی اس ماڈرن اپروچ سے ایسے صلحاء اور متقین کسی معاشرے میں پیدا ہو سکتے ہیں جو شبہات سے بھی بچنے کو اپنی عادت ثانیہ بنا لیں؟

فہم دین　　ڈاکٹر محمد امین

تراویح کے خلاف غامدی صاحب کا گمراہ کن موقف

سوچنے کی بات یہ ہے کہ متجددین ہر معاملے میں سنت رسول کی مخالفت اور تعامل امت کی مزاحمت کیوں کرتے ہیں؟ اور مغربی فکر و تہذیب کے اتباع میں سیکولر و لبرل حکمرانوں اور دانشوروں کی حمایت کیوں کرتے ہیں؟

۱۸/اپریل ۲۰۲۰ء کو 'دنیا' اخبار میں غامدی صاحب کے شاگرد خورشید ندیم صاحب نے 'تراویح کیا ہے' کے عنوان سے اپنے کالم میں لکھا کہ تراویح سنت رسول نہیں ہے۔ ہمیں یہ موقف بہت عجیب لگا اور ہم نے اہل علم کو اس طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ دریں اثناء رمضان سے ایک دن پہلے سیکولر و لبرل اینکر پرسنز کو غامدی صاحب کی حمایت کی ضرورت محسوس ہوئی کیونکہ حکومت روایتی علماء کا یہ موقف ماننے پر مجبور ہوگئی کہ احتیاطی تدابیر کے ساتھ مساجد تراویح کے لیے کھول دی جائیں جبکہ ان سیکولر و لبرل صحافیوں کی دلچسپی اس میں تھی کہ کرونا کے بہانے مسجدیں ویران ہی رہیں تو بہتر ہے۔ چنانچہ غامدی صاحب نے منصۂ شہود پر تشریف لا کر ان کو یہ کہہ کر کمک پہنچائی کہ تراویح تو کوئی نماز ہی نہیں۔ اصل میں نماز تہجد کی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم رات کے آخری حصے میں تنہائی میں ادا کرتے تھے۔

بعض لوگ تقاضا کرتے ہیں کہ علماء کرام دینی دلائل سے ان متجددین کا موقف غلط ثابت کریں اور ہمارے بعض علماء اور سکالرز یہ کرتے بھی ہیں **فجزاهم الله عنا خير الجزاء**۔ راقم عام طور پر ایسا نہیں کرتا کیونکہ اس کی رائے میں صورت یہ نہیں ہے کہ متجددین کو مسئلے کا پتہ نہیں ہوتا کہ ہم انہیں معلومات مہیا کریں۔ یا انہیں کوئی غلط فہمی ہوتی ہے جسے دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ راقم کا تاثر یہ ہے کہ وہ جانتے ہوتے ہیں کہ مسئلہ کی صحیح صورت کیا ہے لیکن وہ جانتے بوجھتے اس کی ایسی تاویل کرتے ہیں جو مغربی فکر و تہذیب کے مطابق ہو اور اس تہذیب کے علمبردار ممالک کی خواہش اور منصوبوں کے مطابق ہو اور مغرب کے گماشتہ مسلم حکمرانوں اور سیکولر دانشوروں کی رائے کے مطابق ہو۔ قرآن حکیم نے اس کا نقشہ کئی جگہ کھینچا ہے اور یہ بتایا ہے کہ بنی اسرائیل اور کفار جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں مثلاً فرمایا ﴿ ثُمَّ

يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ [البقرہ ۲: ۷۵] اور فرمایا ﴿وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ [آل عمران ۳: ۷۵] ہم ان متجددین کے سابقہ طرز عمل سے ایک دو مثالیں دے کر تراویح کے مسئلے کی طرف آئیں گے۔

مثلاً ہم نہیں سمجھتے کہ غامدی صاحب کو پتہ نہیں کہ اسلام زنا بالرضا (Adultery) اور زنا بالجبر (Rape) دونوں کو یکساں شنیع سمجھتا ہے اور ان کی سزا میں فرق احصان (یعنی شادی شدہ ہونے یا نہ ہونے) کی بناء پر کرتا ہے لیکن اس کے باوجود غامدی صاحب نے مشرف کے اس قانون کی حمایت میں مہم چلائی جس میں زنا بالرضا کی سزا کو مشکل بنانا اور اس کی سزا کو کم کرنا مقصود تھا کیونکہ مغربی تہذیب زنا بالرضا کی شناعت کی قائل ہی نہیں۔ اور چونکہ مغرب زنا بالجبر کی سزا بھی موت نہیں دینا چاہتا لہٰذا غامدی صاحب نے یہ موقف اختیار کرلیا کہ اسلام میں رجم زانئ محصن کی سزا ہے ہی نہیں بلکہ یہ تو محاربے اور فساد فی الارض کی سزا ہے۔ اور اس کی دوسری مثال غامدی صاحب کے شاگرد عمار ناصر صاحب کا یہ موقف ہے کہ بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ پر یہودیوں کا حق مسلمانوں سے فائق ہے۔

اب آیئے تراویح کے مسئلے کی طرف۔ غامدی صاحب یقیناً جانتے ہیں کہ مسلم اہل علم میں یہ اختلاف رائے موجود ہے کہ رمضان میں قیام اللیل تہجد کی نماز ہے یا عشاء کے بعد کی نفل نماز (تراویح) ہے لیکن عملاً اس پر ان دونوں گروہوں کا اور ساری امت کا اتفاق ہے کہ عشاء کے بعد مسجد میں قیام اللیل (جسے عہد صحابہ ہی میں تراویح کہا جانے لگا تھا کیونکہ لوگ تراویح لمبی پڑھتے تھے تو درمیان میں استراحت کے لیے تھوڑا وقفہ کرلیتے تھے)۔ نبی کریم ﷺ کی سنت یہ ہے کہ آپ تہجد کے نوافل رمضان، غیر رمضان میں رات کے آخری حصے میں ادا کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ آپ نے دو تین دن یہ نماز صحابہ کو مسجد میں جماعت سے پڑھائی اور پھر اس لیے اس پر مداومت اختیار نہ کی کہ کہیں لوگ اسے فرض و واجب نہ سمجھ لیں (صحیح مسلم، الترغیب فی صلوٰۃ التراویح)۔ حضرت ابی بن کعبؓ نے آپ ﷺ کی زندگی میں گھر کی خواتین کو نماز تراویح پڑھائی اور آکر آپ ﷺ کو بتایا لیکن آپ نے انہیں منع نہیں کیا (صحیح ابن حبان، حدیث ۲۵۴۹)۔ چنانچہ آپ ﷺ کی زندگی میں اور آپ کے بعد عہد ابی بکرؓ و عمرؓ میں لوگ مسجد میں تراویح پڑھتے تھے، انفرادی طور پر بھی اور باجماعت بھی۔ حضرت عمرؓ نے صرف

اتنا کیا کہ انہیں ایک امام کے پیچھے جمع کر دیا اور ایک امام کا تعین کر دیا اور اس طرح اس کو منظم کر دیا(صحیح بخاری، حدیث: ۲۰۱۰)۔ کیونکہ اب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد اس کے شرعاً واجب ہوجانے کا احتمال باقی نہ رہا تھا لہٰذا امت نے اسے سنت رسول سمجھ کر اس پر مداومت اختیار کر لی کیونکہ یہ عمل مقاصد شریعت کو بہت زیادہ پورا کرنے والا تھا (یعنی حصول تقویٰ کے لیے دن میں روزہ رکھنا، رات میں قیام اللیل کرنا اور قرآن پڑھنا اور سننا)۔ چنانچہ پچھلے ۱۴۴۰ سال سے ساری امت مداومت سے اس پر عمل کر رہی ہے۔ وہ بھی جو نماز تہجد کو تنہائی میں ادا کرنے کو قیام اللیل کہتے ہیں اور وہ بھی جو اسے نماز عشاء سے متصل مسجد میں باجماعت نوافل ادا کرنے کو قیام اللیل سمجھتے ہیں۔(کیونکہ ہمارے مخاطب غامدی مکتب فکر کے سکالرز اور دیگر اہل علم ہیں لہٰذا ہم احادیث کا عربی متن اور اردو ترجمہ نہیں دے رہے)۔

اب غامدی صاحب کی چال یا کمال دیکھیے کہ وہ ان سارے مباحث سے واقف ہیں لیکن چونکہ مقصد سیکولر ولبرل حکومت خصوصاً پیپلز پارٹی کی سندھ حکومت)اور سیکولر ولبرل عناصر خصوصاً میڈیا والوں کو سپورٹ کرنا تھا یعنی کرونا کے بہانے اور احتیاط کے نام پر مساجد کی بندش اور ویرانی (حالانکہ ہزاروں فیکٹریاں، کارخانے، منڈیاں، بنک، دکانیں، تقسیم راشن، کے اڈے کھلے ہوئے ہیں)اس لیے غامدی صاحب نے اعلان کر دیا کہ تراویح تو سنت رسول ہے ہی نہیں یہ تو رات کے آخری پہر تہجد کی تنہائی کی نماز تھی جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیشہ پڑھی۔ اسی طرح یہ بھی کہا کہ تراویح میں پورا قرآن پڑھنا اور سننا اور شبینے کرنا یہ سب سنت رسول نہیں ہے۔

سنت کی مخالفت کی وجہ

اچھا یہاں ذرا یہ بھی دیکھیے کہ یہ لوگ سنت کی مخالفت کیوں کرتے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر سنت کو بیچ میں سے نکال دیا جائے تو پھر قرآن کی من مانی تشریح کرنے کا راستہ کھل جاتا ہے اور اپنے مغرب زدہ فاسد خیالات کو قرآن کے سر تھوپ کر پیش کر دیا جاتا ہے کہ قرآن یہ کہتا ہے، قرآن وہ کہتا ہے، قرآن کا مقصد یہ ہے۔ انکار سنت کے اگرچہ کئی طریقے منکرین سنت نے مستشرقین سے سیکھے ہیں مثلاً یہ کہ فلاں حدیث قرآن کے خلاف ہے، فلاں حدیث عقل اور سائنس کے خلاف ہے لیکن اس بارے میں غامدی صاحب نے ایک نیا راستہ نکالا ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے سنت کی وہ تعریف ہی بدل دی ہے جو مسلمان امت اور اہلِ علم صحابہ

کرام سے لے کر آج تک کرتے آئے ہیں اور سنت کی نئی تعریف متعین کر دی ہے۔ لہٰذا اب غامدی صاحب اور ان کے شاگردوں کو یہ کہنے کا کوئی فائدہ نہیں کہ فلاں بات اس لیے سنت رسول ہے کہ اس کے سارے راوی ثقہ ہیں یا وہ بخاری اور مسلم میں موجود ہے یا وہ محدثین کے نزدیک ''صحیح'' ہے۔ یہ سارے اصول ان کے لیے دفتر بے معنی ہیں کیونکہ ان سب کے باوجود وہ کسی بھی حدیث کو اپنی طے کردہ تعریف کے مطابق ردّ کر دیتے ہیں۔ چنانچہ غامدی صاحب گنتی کی چند باتوں کو ہی سنت قرار دیتے ہیں اور باقی سارے ذخیرۂ احادیث کو 'روایات'، 'اخبار' اور 'ظن' قرار دے کر ردّ کر دیتے ہیں جبکہ عام مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ جب رسول کریم ﷺ نے مسجد میں تراویح پڑھی ہیں، صحابہؓ کو پڑھائی ہیں، آپ ﷺ نے امت کو پڑھنے کی ترغیب دی ہے، آپ کے صحابہ کرام نے مداومت سے پڑھی ہیں اور شروع سے آج تک ساری امت انہیں سنت رسول سمجھ کر پڑھتی آ رہی ہے تو ان کے سنت رسول ہونے میں کیا شک ہے؟ لیکن غامدی صاحب ان کو اس لیے سنت نہیں مانتے کہ یہ ان کی سنت کی تعریف پر پورا نہیں اُترتیں۔

اس بحث کو سمیٹنے سے پہلے مناسب محسوس ہوتا ہے کہ ہم رمضان میں قیام اللیل کی اہمیت اور قرآن کی اس سے نسبت اور فضیلت کو قرآن وسنت کی روشنی میں اختصار سے بیان کر دیں:

دیکھیے قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس نے قرآن کو رمضان میں اتارا ہے (البقرہ ۲: ۱۸۵) اور لیلۃ القدر کی رات میں اتارا ہے اور جس کی فضیلت یہ بتائی ہے کہ اس ایک رات کی عبادت ایک ہزار مہینے سے افضل ہے (القدر ۹۷: ۳) اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ یہ رات رمضان کے آخری عشرے میں ہے (صحیح بخاری، حدیث: ۲۰۱۷)۔ قرآن کا اس ایک رات کی اتنی فضیلت بیان کرنا گویا بالواسطہ طور پر اس میں عبادت کے اہتمام کی دعوت ہے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ اس رات کو پانے کے لیے رمضان کے آخری عشرے میں طویل قیام اللیل کیا کرتے تھے اور رات بھر جاگا کرتے تھے اور حضرت عائشہؓ کے بقول اپنے اہل وعیال کو بھی جگاتے تھے (صحیح بخاری، حدیث: ۲۰۲۴)۔

قیام اللیل میں آپ ﷺ کے قرآن پڑھنے کی کثرت کا ذکر حضرت حذیفہؓ نے کیا ہے جنہوں نے آپ کے ساتھ قیام اللیل کیا اور بتایا کہ پہلے آپ نے سورۂ بقرہ پڑھی، پھر آل عمران اور پھر النساء شروع کر دی اور ابھی آپ پڑھ رہے تھے کہ نماز فجر کی اذان کے لیے بلال

آ گئے(صحیح مسلم، حدیث: ۱۸۱۴)۔آپ ﷺ کی تقلید میں صحابہ کرام تراویح میں اتنا طویل قیام اللیل کرتے تھے کہ حضرت عبدالرحمنؓ کے بیان کے مطابق تراویح میں کھڑے کھڑے ہماری ٹانگیں درد کرنے لگتی تھیں اور ہم عصا کا سہارا لے لیتے تھے اور امام ساری رات تراویح میں قرآن پڑھتے تھے اور اس وقت ختم کرتے تھے جب بمشکل گھر جا کر سحری کھانے اور واپس نماز کے لیے آنے کا وقت بچتا تھا(موطا امام مالک، حدیث: ۲۵۳)۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ صحیح احادیث کی رو سے آپ ﷺ حضرت جبریل کے ساتھ قرآن کا دور رمضان کے آخری عشرے میں کیا کرتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ آپ رمضان کے آخری عشرے میں ہمیشہ اعتکاف کیا کرتے تھے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ آخری عشرے میں قرآن ختم کرتے تھے۔ اپنی زندگی کے آخری عشرے میں آپ نے دو دفعہ قرآن کا دور کیا(صحیح بخاری، حدیث: ۴۶۱۴)۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے پانچ دن میں قرآن ختم کیا۔

قرآن کی کثرت تلاوت کا یہی ذوق صحابہ کرام میں تھا۔ اور وہ بہت زیادہ تلاوت کرنا چاہتے تھے لیکن نبی کریم ﷺ نے انہیں سات دن میں ختم کرنے کو کہا(صحیح بخاری، حدیث: ۵۰۵۳)اور تین دن سے کم میں ختم کرنے سے منع کیا(ابوداؤد، حدیث: ۱۳۹۴)۔اس لیے بہت سے اسلاف خصوصاً امام بخاری تین دن میں قرآن ختم کیا کرتے تھے(مقدمہ فتح الباری)۔

ظاہر ہے کہ تلاوت کی کثرت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ قرآن زیادہ سے زیادہ زبانی یاد ہو۔ چنانچہ مسلمانوں میں حفظ قرآن کا ذوق ترقی کر گیا اور صحابہ میں حفاظ کی کثرت ہوگئی۔ روایات میں آتا ہے کہ جب جنگ یمامہ میں بہت سے حفاظ شہید ہو گئے تو حضرت عمرؓ تدوین قرآن کی طرف متوجہ ہوئے(صحیح بخاری کتاب فضائل القرآن باب)۔

الغرض رمضان میں دن میں روزہ رکھنا اور رات میں قیام کرنا شرعاً مطلوب ہے، دین اس کی ترغیب دیتا ہے تھا چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جس نے رمضان کے روزے رکھے، کما حقہ، تو اس کے سارے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں(صحیح بخاری، حدیث: ۳۸)۔اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ جس نے رمضان میں رات کو قیام کیا، کما حقہ، تو اس کے بھی تمام گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں(صحیح بخاری، حدیث: ۳۷)۔

متجددین کے لیے دعا

خلاصہ یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ نے رمضان کو ماہِ تقویٰ قرار دیا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مسلمانوں کو دن میں روزے رکھنے، رات کو قیام کرنے اور دوسرے معاصی سے بچنے کا حکم دیا ہے تاکہ رجوع الی اللہ کا ماحول پیدا ہو۔ خشیت کا ماحول بنے، عبادت کا ذوق پروان چڑھے۔ یوں رمضان نیکیوں کا موسم بہار بنے۔ بدنصیب ہیں یہ متجددین جو تہذیب مغرب سے متاثر ہو کر اور مسلم معاشرے کے سیکولر و لبرل عناصر کی حمایت کے زعم میں قیام اللیل کو خلاف سنت قرار دیتے ہیں اور سارا قرآن پڑھنے اور سننے کے اہتمام کو خلاف سنت قرار دیتے ہیں۔ یہ اللہ اور رسول کی اس اسکیم کی نفی کے مترادف ہے جس کی رو سے رمضان ماہِ تقویٰ ہے اور اس میں روزہ رکھنا، قرآن کی تلاوت کثرت سے کرنا، رات کو اللہ کے حضور کھڑے ہونا اور اس سے رحمت و مغفرت کی دعائیں مانگنا مطلوب و مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ ان متجددین کو ہدایت نصیب فرمائے تاکہ یہ نصوص شریعت اور مقاصد شریعت کی مخالفت کر کے اور احداث فی الدین کے مرتکب ہو کر اپنی عاقبت خراب نہ کریں اور دین میں فساد نہ پھیلائیں۔

کچھ اپنی کمزوریوں پر نظر

تراویح کے حوالے سے متجددین خصوصاً غامدی صاحب کا نقطۂ نظر چونکہ غلط تھا اس لیے ہم نے اس کا ردّ مناسب سمجھا.... لیکن حق یہ ہے کہ تراویح کا جو نظام ہمارے ہاں رائج ہے اس میں کئی خامیاں اور نقائص ہیں جن کو دور کیا جانا چاہیے۔ لیکن بدقسمتی سے انہیں دور کرنے کی فکر ہمارے معاشرے میں موجود نہیں ہے اور نہ ہمارے علماء کرام اس کی اصلاح کی طرف زیادہ توجہ دیتے ہیں۔

ہم نے دیکھا ہے کہ کئی لوگ تاخیر سے مسجد میں آتے ہیں اور آتے ہی تراویح میں شامل ہو جاتے ہیں۔ غالب امکان یہ ہے کہ انہوں نے عشاء کی نماز نہیں پڑھی ہوتی۔ ظاہر ہے یہ تراویح کی اہمیت کا غلط تصور ہے کہ آپ فرض نماز تو جماعت سے نہ پڑھیں بلکہ مسجد میں آ کر انفرادی طور پر بھی نہ پڑھیں اور تراویح میں شامل ہو جائیں۔ گویا آپ تراویح کو فرض پر بھی ترجیح دیتے ہیں۔

اسی طرح ہماری بہت سی مسجدوں میں قاری صاحب اتنی تیزی سے قرأت کرتے ہیں کہ مقتدیوں کو کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کیا پڑھ رہے ہیں؟ بعض اوقات ایک گھنٹے سے بھی کم میں بیس

رکعات تراویح پڑھ کر لوگ فارغ ہو جاتے ہیں۔

یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہمارے علماء کرام لوگوں کو ناظرہ قرآن تو پڑھاتے ہیں، ترجمے کے ساتھ نہیں پڑھاتے۔ جہاں حفظ کا نظام ہے وہاں بھی قرآن رٹ لیا جاتا ہے اور اس کے فہم و ترجمہ کا اہتمام نہیں ہوتا۔ گویا نہ قرآن پڑھنے والے کو پتہ ہوتا ہے کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے اور نہ سننے والے کو کچھ پتہ ہوتا ہے کہ وہ کیا سن رہا ہے؟ بلاشبہ قرآن کے ساتھ یہ عقیدت ومحبت ہمارا عظیم سرمایہ ہے کہ سمجھ نہ آنے کے باوجود لوگ قرآن سننے کے لیے قیام کرتے ہیں اور قاری صاحب نہ سمجھنے کے باوجود قرآن سناتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے یہ شریعت کا مقصود نہیں ہے۔ شریعت کو مقصود یہ ہے کہ ہم قرآن پڑھیں تو سمجھیں کہ کیا پڑھ رہے ہیں اور سنیں تو سمجھیں کہ کیا سن رہے ہیں تاکہ جہنم کا ذکر آئے تو ہم اس سے پناہ مانگیں، جنت کا ذکر آئے تو اس کے حصول کی دعا کریں وغیرہ۔ ظاہر ہے جب تک ہم قرآن کو سمجھیں گے نہیں تو اس پر عمل کیسے کریں گے؟ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قرآن اس لیے نازل ہوا ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ اس لیے نازل نہیں ہوا کہ ہم اسے ہمیشہ بے سوچے سمجھے پڑھتے رہیں اور رٹ لیں۔ یہ ایک بھیانک صورتِ حال ہے جس کی اصلاح ضروری ہے اور علماء کرام کو اس طرف بہت سنجیدہ توجہ دینی چاہیے۔ ہم اس کا انکار نہیں کرتے کہ قرآن ناظرہ پڑھنے کا بھی ثواب ہے لیکن اس کا یہ مطلب کب ہے کہ قرآن کو سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی جائے۔ ہم علماء کرام سے مطالبہ کرتے ہیں کہ جہاں بھی حفظ قرآن کے مکاتب یا شعبے کھلے ہوئے ہیں وہاں طلبہ کو قرآن کا ترجمہ بھی سکھایا جائے اور علماء کرام عام مسلمانوں کو بھی صرف ناظرہ نہ پڑھائیں بلکہ لازماً ترجمہ بھی پڑھائیں۔ اسی طرح بہت تیزی سے قرآن پڑھنے کی بجائے آہستہ پڑھنا چاہیے تاکہ اس پر تدبر کیا جا سکے تاکہ اس کے اثرات ہم پر پڑیں۔

اسی طرح یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ کچھ تنظیموں اور اداروں نے، کچھ عرصے سے، اعتکاف جیسی انفرادی عبادت کو اجتماعی شکل دے دی ہے اور وہ باقاعدہ عارضی شہر اعتکاف سجاتے ہیں۔ یہ بھی یقیناً مقاصد شریعت کے خلاف ہے اور اس سے احتراز ضروری ہے۔

رمضان اور تراویح سے متعلق جن خامیوں کی ہم نے سطور بالا میں نشاندہی کی ہے علماء کرام کو چاہیے کہ ان خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں تاکہ مخالفین کو طعن وتشنیع کا موقع نہ ملے کہ یہ لوگ تراویح کا حق ادا نہیں کر رہے محض بے روح رسم پوری کر رہے ہیں۔

اسلام اور عصر حاضر سید سعادت اللہ حسینی[۱]

عصر حاضر میں اسلام کو درپیش چیلنج[۲]

[سید سعادت اللہ حسینی صاحب کا یہ مضمون اپریل کے آخری دنوں میں ہمارے علم میں آیا جب (مئی کا) البرہان تیار ہو چکا تھا۔ مضمون انتہائی اہم علمی وفکری مباحث پر مشتمل ہے جن کے بارے میں ہم بھی کچھ کہنا چاہتے تھے۔ لہٰذا اس پر ہمارا استدراک اگلے ماہ کے البرہان میں ملاحظہ فرمائیں، ان شاء اللہ۔ مدیر]

عصر حاضر میں اسلام کو درپیش چیلنجوں کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے عصر حاضر کو سمجھنا ضروری ہے۔ چیلنجوں اور مسائل کے حوالے سے عصر حاضر کو دیکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ آج کے علاوہ آنے والے کل کو بھی یعنی قریبی مستقبل کو بھی دیکھا جائے۔ اس حوالہ سے جب ہم دنیا پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دور معمولی تبدیلیوں کا دور نہیں ہے بلکہ بہت بڑی، دوررس، ہمہ گیر اور تیز رفتار تبدیلیوں کا دور ہے۔

۱۔ عصر حاضر کی کچھ انقلاب آفریں خصوصیات

گذشتہ چند صدیوں سے دنیا کے حالات پر ٹکنالوجی کا بڑا گہرا اثر ہے۔ تمدن اور تمدنی احوال ہی نہیں بلکہ افکار و نظریات اور سیاسی و معاشی فلسفے بھی ٹکنالوجی کے ذریعہ ہونے والی تمدنی تبدیلیوں سے متاثر ہوتے رہے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ لبرل ڈیموکریسی ایک ایسے تمدن کی پیداوار تھی جو بھاپ کے انجنوں، تیل کے کارخانوں اور ٹیلی ویژن و ٹیلی فون کی ایجادات کے ذریعہ وجود میں آیا تھا۔ عصر حاضر کی ٹکنالوجی انفارمیشن ٹکنالوجی اور بایوٹکنالوجی ہے۔ اس انفوٹیک اور بایوٹیک انقلاب کے نتیجہ میں ایک بالکل نئی دنیا پیدا ہو رہی ہے اور یہ کہا جا رہا ہے کہ لبرل ڈیموکریسی، اس نئی دنیا اور اس کی ترقیوں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے ایک نئے نظام، نئے اصولوں اور قدروں کی ضرورت ہے۔[۱]

بایوٹیک اور انفوٹیک کے امتزاج کے نتیجہ میں آنے والا انقلاب ایک ہمہ گیر انقلاب

---

[۱] امیر جماعت اسلامی ہند

[۲] یہ مقالہ ادارہ تحقیق وتصنیف علی گڑھ کے سیمینار مارچ 2020ء میں بطور کلیدی خطاب پیش کیا گیا

ہوگا۔ اندازہ یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سماجی، سیاسی، تہذیبی اور اخلاقی تبدیلیاں، اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور ہمہ گیر ہوں گی جو صنعتی انقلاب نے پیدا کی تھیں۔ صنعتی انقلاب نے انسانوں کو فطرت اور فطری وسائل پر غیر معمولی کنٹرول عطا کیا تھا جبکہ بایوٹیک اور انفوٹیک انسانوں کے اندرونی نظاموں پر کنٹرول فراہم کررہے ہیں۔ حتیٰ کہ انسانی خیالات کو مشینوں کے زیرسایہ لا رہے ہیں۔ ہم بہت تیزی سے ایک ایسی دنیا کی طرف بڑھ رہے ہیں جہاں بگ ڈاٹا[۲](big data) سب سے بڑی تمدنی قوت بن جائے گا[۳] اور ایک ایک انسان کی ایک ایک لمحہ نگرانی (surveillance)، اور اس کو کنٹرول کرنے کی صلاحیت فراہم کرے گا، جہاں حکمرانی اور بڑے فیصلے الگورتھم[۴] کریں گے اور اس کے نتیجہ میں الگو کریسی (algocracy) بلکہ اس سے آگے بڑھ کر الگورتھمک ڈکٹیٹرشپ (algorithmic dictatorship) کی راہیں ہموار ہوں گی، جہاں آگمینٹڈ ریئالٹی (augmented reality)[۵] کا انقلاب میڈیا کو انسانی افکار و خیالات بلکہ تصورات پر تک غیر معمولی کنٹرول فراہم کرے گا، جہاں بلاک چین (block chain) مالیات[۶]، سارے مالیاتی نظاموں اور لین دین کے تمام معروف طریقوں کو درہم برہم کرکے رکھ دے گی، اور جہاں مصنوعی ذہانت (artificial intelligence) کی حامل مشینوں پر انسان کا ہر چھوٹے سے چھوٹا قدم منحصر ہوگا۔[۷] اس میں کیا شک ہوسکتا ہے کہ اس نئی دنیا میں، دورِ جدید کی، یعنی صنعتی انقلاب کے بعد پیدا ہونے والے دور کی ہر چیز غیر متعلق ہوتی جارہی ہے۔ جن لوگوں کی ٹکنالوجی کے ان انقلابات پر نظر ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ صورتِ حال بہت زیادہ دور نہیں ہے۔ ان میں سے بہت سی تبدیلیاں پہلے ہی کافی آگے بڑھ چکی ہیں اور جانے انجانے ہم سب کی زندگیوں پر اس کے اثرات پڑ رہے ہیں۔ آزادی، جمہوریت، ملکوں کی خودمختاری، پرائیویسی اور اس جیسی بے شمار قدریں جنھوں نے بیسویں صدی پر حکومت کی تھی، اور جن پر جدید انسان کو فخر تھا، اب تیزی سے ٹکنالوجی کی حرارت میں تحلیل ہوتی جارہی ہیں۔ صنعتی انقلاب نے ماحولیاتی بحران پیدا کیا تھا۔ یہ بحران آج بھی انسانیت کا سنگین مسئلہ ہے۔ لیکن اب جبکہ ٹکنالوجی کی رسائی انسانی دماغ، انسانی اعصاب اور انسانی نفس کے انتہائی اندرون تک ہونے لگی ہے، اس کے نتیجہ میں انسانیت کا ماحولی نظام (ecosystem) کس بحران

سے دو چار ہوگا؟ اس کا تصور کرنا بھی آج ممکن نہیں ہے۔

ان حالات میں بے شک دنیا کو ایک نئے نظام اور نئی اقدار کی ضرورت ہوگی۔ مستقبلیات کے ایک مشہور ماہر یوال نو ہیراری کی مشہور کتاب ''اکیسویں صدی کے اکیس سبق''(21 Lessons for the 21st Century) کے پہلے باب کا عنوان ہے، مایوسی (disillusionment)۔ مصنف نے گذشتہ صدی کے احوال کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ہے کہ دوسری عالمی جنگ سے پہلے دنیا کے حالات تین بڑے عالمی نظریات (grand stories) کی کشمکش سے عبارت تھے، یعنی فسطائیت (ایک قوم کے غلبہ کا نظریہ)، کمیونزم (معاشی مساوات کا نظریہ) اور لبرلزم (آزادی اور جمہوریت) دنیا میں اپنی بالادستی کی لڑائی میں مصروف تھے۔ اس طرح ۱۹۳۹ء میں تین نظریات دنیا پر حکومت کا خواب دیکھ رہے تھے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد فسطائیت دنیا کے اسٹیج سے غائب ہوگئی۔ اور ۱۹۶۹ء میں صرف دو نظریات باقی رہ گئے۔ ۱۹۹۱ء کے آتے آتے کمیونزم بھی غائب ہوگیا اور صرف لبرل ڈیموکریسی باقی رہ گئی اور تاریخ کے خاتمہ کی پیش گوئی کی جانے لگی۔ لیکن ۲۰۰۸ء کے مالیاتی بحران اور ۲۰۱۶ میں ٹرمپ کے انتخاب اور بریگزٹ وغیرہ جیسے واقعات نے بالآخر لبرل ڈیموکریسی کو بھی دنیا کے اسٹیج سے رخصت کر دیا ہے اور ۲۰۱۹ء کے آتے آتے یہ صورتِ حال بن گئی کہ دنیا سے سارے عالمی نظریات رخصت ہو گئے اور دنیا ایک نئے عالمی نظریہ کی تلاش میں ہے۔[۸]

۲۔ نئے عالمی نظریہ میں مذہب کا رول

یہ نیا عالمی نظریہ کیا ہوگا؟ اس کے سلسلے میں کم از کم یہ بات اب بڑے پیمانہ پر تسلیم کی جانے لگی ہے کہ اس کی تشکیل میں مذہب اور مذہبی قدروں کی اہمیت بہت زیادہ ہوجائے گی۔ سابق برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیر نے چند سال قبل کہا تھا کہ اکیسویں صدی کی دنیا میں مذہب اور مذہبی عقیدہ کی وہی مرکزی اہمیت ہوگی جو بیسویں صدی میں سیاسی نظریات کی تھی۔ اور یہ کہ آج کی دنیا کو جن قدروں کی ضرورت ہے وہ مذاہب ہی فراہم کر سکتے ہیں۔[۹]

Religious faith will be of the same significance to the 21st century as political ideology was to the 20th century

بین الاقوامی امور کے ماہر مشہور مصنف اور دانشور اسکاٹ ایم تھامس نے اپنی شہرہ

آفاق کتاب The Global Resurgence of the Religion میں دعویٰ کیا ہے کہ مذہب اور مذہبی عقیدہ اکیسویں صدی کے ’عالمی نظام کی روح‘ (soul of the world) ہوگا اور یہ کہ بیسویں صدی ’آخری جدید صدی‘ (the last modern century) ثابت ہوگی، یعنی وہ نظریات جنھوں نے صنعتی انقلاب کے بعد کے جدید دور پر حکومت کی تھی اکیسویں صدی میں غیر متعلق ہوجائیں گے۔[۱۰]

یہ دو حوالے ہم نے بطور نمونہ نقل کیے ہیں۔ اس طرح کے متعدد حوالے نقل کیے جاسکتے ہیں۔ ہر شعبۂ حیات میں اب مذہب، مذہبی عقیدہ اور مذہبی قدروں کی ضرورت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا جارہا ہے۔ جس نئی دنیا کی طرف ہم تیزی سے بڑھ رہے ہیں، گہری روحانیت اور مضبوط مذہبی بنیاد کے بغیر اس دنیا کا چلنا بالکل ناممکن ہوگا۔

ایک طرف مذہب کی یہ بڑھتی ہوئی اہمیت ہے اور دوسری طرف مختلف عالمی مذاہب کا تیز رفتار زوال ہے۔ اس زوال کے تجزیہ کا اس وقت موقع نہیں ہے۔ لیکن اس بات کے متعدد شواہد موجود ہیں کہ مختلف عالمی مذاہب نے گذشتہ صدیوں میں جدیدیت اور جدید مغربی تہذیب کے آگے سپر انداز ہوکر اپنی روح کھودی ہے۔ اب میدان میں یا تو اسلام ہے یا مختلف نیم مذہبی روحانی فلسفے اور تحریکیں۔ اسلام جدیدیت کے طوفان کے سامنے بھی اپنے واضح عقیدہ اور نہایت پائیدار بنیادوں کی وجہ سے ٹکا رہا۔ گذشتہ صدیوں میں اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے بنیاد پرستی کی تہمت کا سزاوار بھی ہوا لیکن واقعہ یہ ہے کہ آج اسلام کی یہی خصوصیت اس کی سب سے بڑی طاقت ثابت ہورہی ہے۔ اور جیسے جیسے اکیسویں صدی کے پر پیچ احوال انسانی زندگی کو نت نئے چیلنجوں سے دوچار کریں گے، اسلام کا یہ ثبات، دنیا کی بڑی ضرورتوں کی تکمیل کا سامان فراہم کرے گا۔ ان شاء اللہ العزیز۔ یہ صورتِ حال اہل اسلام کے لیے ایک بڑے موقع کی بھی حیثیت رکھتی ہے اور ایک بڑے چیلنج کی بھی۔

۳۔ اسلام کی قدریں اور ان کی کشش: خاندانی نظام بطور مثال

اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی قدریں، سماجی اور تاریخی روایات کی ناپائیدار بنیادوں پر کھڑی ہوئی نہیں ہیں۔ یہ بنیادیں کتنی ہی مضبوط ہوں، جدید تہذیب اور استعمار کے

طاقتور ہتھکنڈوں کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ اسلام کی قدروں کی بنیاد نہایت مستحکم عقائد پر رکھی گئی ہے۔قریبی زمانہ میں اس کی ایک نمایاں مثال خاندان اور خاندانی زندگی ہے۔ مغربی دنیا میں، مرد وزن کے درمیان غیر فطری مساوات کی کوششوں نے سب سے زیادہ خاندان کے ادارہ کو تباہ کردیا۔خاندان کی تباہی نے سماجی زندگی کے ہر پہلو پر اثر ڈالا۔اور دنیا بھر کے معاشرے اس طوفان سے متاثر ہوتے چلے گئے۔ ایک مسلمان معاشرہ خاندانی زندگی کی قدروں اور عورت کے نسوانی کردار کا تحفظ کرتا ہے تو اس کی وجہ صرف یہی نہیں ہوتی کہ اس معاشرہ کی قدیم روایتیں اس کا تقاضا کرتی ہیں بلکہ اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ یہ معاشرہ اس پر پختہ ایمان رکھتا ہے کہ یہ خدا کے احکام ہیں جن میں تبدیلی کا اسے کوئی اختیار نہیں ہے۔ یہ پختہ ایمان ہی اُس طوفان بلاخیز کا مقابلہ کرسکتا ہے جو جدید مغرب کی دانش گاہوں سے اٹھا اور اب ساری دنیا کے روایتی ڈھانچوں کو ملیامٹ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ اب خاندان اور عورت کے نسوانی وجود کی آخری پناہ گاہ، اسلام ہی باقی رہ گئی ہے۔

ایک طرف یہ صورتِ حال ہے اور دوسری طرف مختلف وجوہ سے موجودہ دنیا میں خاندان کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ چنانچہ اسلام کا خاندانی نظام بہت سے لوگوں کے لیے زبردست کشش کا باعث ہے تو اسلام مخالف طاقتوں کے لیے اسلام سے خوف کا بھی ایک اہم سبب ہے۔مشہور نومسلم دانشور مراد ولفریڈ ہافمین نے اپنی فکر انگیز کتاب[11] Religion on the Rise: Islam in the Third Millenium بہت تفصیل سے واضح کیا ہے کہ خاندانی نظام اور خاندانی قدریں اسلام کی بہت بڑی طاقت ہیں اور مستقبل میں یہ مغربی دنیا میں اسلام کے لیے بہت بڑی کشش پیدا کریں گی۔

چند سال پہلے کیمبرج یونیورسٹی کے سنٹر فار اسلامک اسٹڈیز نے ایک دل چسپ اسٹڈی کی تھی۔ اس نے نومسلم برطانوی خواتین سے انٹرویو کیے اور وجہ جاننے کی کوشش کی کہ انھوں نے اسلام کیوں قبول کیا؟ چنانچہ یہ اسٹڈی مکمل ہوئی اور مارچ ۲۰۱۳ء میں اس کی تہلکہ مچادینے والی رپورٹ[12] Female Perspectives :Narratives of Conversion to Islam کے نام سے شائع ہوئی۔ اس میں ان اعلی تعلیم یافتہ خواتین نے قبول اسلام کے جو اسباب گنائے ا ن میں سے بیشتر کا تعلق عورت اور خاندان سے متعلق اسلام کی تعلیمات سے ہے۔مئی ۲۰۱۷

ءمیں نیو یارک ٹائمز نے خاندان سے متعلق مطالعات کے ایک اہم ادارہ کے حوالہ سے سروے رپورٹ شائع کی جس کے مطابق امریکہ میں اب نئی نسل یعنی ۱۷سال سے ۳۴سال کے درمیان کی عمر کے افراد(millenials) روایتی صنفی رول کو ترجیح دیتے ہیں۔اس سے قبل کی نسلوں میں فیمینسٹ تصورات مقبول تھے لیکن اب نئی نسل کے امریکی، خاندان کے روایتی تصور کی طرف تیزی سے پلٹ رہے ہیں۔[۱۳]

اسلامی خاندان اس بدلی ہوئی دنیا میں انسانیت کے لیے بہت بڑی کشش کا باعث بن سکتا ہے۔لیکن اس کی دو ضرورتیں ہیں۔پہلی ضرورت تو یہ ہے کہ اسلام کی خاندانی تعلیمات اور قدروں کو مستحکم دلائل کے ساتھ دنیا کے سامنے لایا جائے اور خاندان کے حوالے سے ایک طاقتور ڈسکورس کھڑا کیا جائے۔اس وقت خاندان اور خاندانی قدریں، دنیا بھر میں موضوع بحث ہیں۔جدیدیت نے خاندان کے ادارہ کا استخفاف کیا تھا۔اب خاندان کی ضرورت کا انکار ممکن نہیں رہا لیکن خاندان کے نام پر ایسے رجحانات کی ہمت افزائی کا سلسلہ برابر جاری ہے جو خاندانی نظام کے لیے سم قاتل ہیں۔بوائے فرینڈ اور گرل فرینڈ اور لیو ان ریلیشن کے خاندان، گے اور لیسبین خاندان جس میں ایک ہی جنس کے جوڑے بچوں کو گود لے کر نام نہاد خاندان کی تشکیل کرتے ہیں، یہ سب رجحانات بھی خاندانی ادارہ کے خاتمہ ہی میں مدد دینے والے ہیں۔ان سب پر مدلل تنقید اور اسلام کے اصول خاندان کی مدلل وضاحت کے ذریعہ اہل اسلام کو خاندان اور نظام خاندان کے سب سے بڑے وکیل کے طور پر سامنے آنا چاہیے۔

دوسری ضرورت یہ ہے کہ خواتین اور خاندان سے متعلق بعض اہم امور میں اجتہاد کی اُس ضرورت پر فوری توجہ دی جائے جن کے بغیر اسلام کا خاندانی نظام عصر حاضر کے مسائل سے نبرد آزما نہیں ہوسکتا اور خاندان سے متعلق نئے پیش آمدہ مسائل پر سنجیدگی سے غور کیا جائے اور ان کے حل تلاش کیے جائیں۔ان امور کی تفصیل میں جانے کا اس وقت موقع نہیں ہے۔

خاندانی نظام کی قدروں کو ہم نے بطور مثال پیش کیا ہے۔اسی طرح کی کشش اسلام کی معاشی قدروں، ماحولیاتی قدروں اور دیگر بہت سی قدروں میں پائی جاتی ہے۔اس بات کی ضرورت ہے کہ عصری فلسفہ، سماجیات، اجتماعی نفسیات اور قدریات کے اصولوں کو سامنے رکھ کر ان قدروں کی معقولیت اور معنویت کو دنیا کے سامنے لایا جائے۔

۴۔ ہمہ تہذیبی معاشرہ کے چیلنج

نئی دنیا کی ایک اہم خصوصیت اس کی ہمہ تہذیبیت ہے۔ اس وقت بھی عالمی مسلم آبادی کا تقریباً ایک تہائی حصہ ان ملکوں میں آباد ہے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ مہاجرت کے تیز رفتار سلسلے اس تناسب کو اور بڑھائیں گے۔ عالم اسلام کی آبادی میں نوجوانوں کا بڑا تناسب اور دوسری طرف یورپ اور جاپان جیسے ملکوں میں بوڑھوں کا تیزی سے بڑھتا ہوا تناسب، مہاجرت کے رجحان کو تیزی سے فروغ دے رہے ہیں۔ متعدد مطالعات میں یہ اندازہ کیا جارہا ہے کہ مستقبل قریب میں فعال اور باصلاحیت نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد یورپ، امریکہ و کناڈا اور آسٹریلیا و نیوزی لینڈ جیسے مغربی ملکوں میں آباد ہوگی۔ یورپ کے کئی ملکوں میں مسلمان بہت جلد ایک بااثر اقلیت بن جائیں گے اور پورے براعظم یورپ میں مسلمانوں کا تناسب تقریباً وہی ہوگا جو اس وقت ہمارے ملک ہندوستان میں ہے۔[۱۴] خود ہمارے ملک میں مسلمان ایک بڑی اقلیت کے طور پر رہ رہے ہیں۔ پھر اس وقت دنیا کے مختلف معاشرے ٹکنالوجی اور ایک دوسرے پر انحصار کی وجہ سے باہم جڑ رہے ہیں اور مسلمان ملکوں میں بھی وہ تہذیبی حصار تیزی سے ختم ہوتا جارہا ہے جس کے ہم صدیوں سے عادی رہے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں پوری دنیا ایک واحد ہمہ تہذیبی سماج کا روپ لیتی جارہی ہے۔ ان حالات میں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ایک ہمہ تہذیبی معاشرے میں اسلامی زندگی کے خدوخال اور اسلامی نصب العین کی صورت گری وضاحت کے ساتھ ہو۔

اسلامی تاریخ کے لیے ہمہ تہذیبی معاشرہ کوئی نامانوس چیز نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ کے زمانے ہی میں مدینہ اور اس کے اطراف میں مشرک قبائل بھی تھے اور ان کے علاوہ بااثر یہودی قبائل بھی تھے جن کی معاشرت اور تہذیب اور دین وطرز زندگی، دیگر عربوں سے بالکل مختلف تھا۔ خود مسلمانوں میں مہاجرین وانصار کے رہن سہن اور تہذیبی طور طریقوں میں بڑا فرق تھا۔ خلفاء راشدین کے ادوار میں جب فارس وروم کے علاقے فتح ہوئے، اور اس کے بعد امویوں اور عباسیوں کے دور میں تو غیر معمولی تہذیبی تنوع (cultural diversity) اسلامی علاقوں میں پیدا ہوگیا۔ مذہبی اعتبار سے مسلمانوں کے ساتھ، یہودی، عیسائی، زرتشی، ہندو، مشرکین اور افریقہ وایشیا کے بہت سے مقامی مذاہب کے ماننے والے اسلامی علاقوں میں

رہنے لگے۔ امام ابن تیمیہؒ، مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہؒ جیسی بلند پایہ اسلامی شخصیتوں کو ایک ہمہ تہذیبی سماج کے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ ترکی کی سلطنت عثمانیہ اور ہندوستان کی سلطنت مغلیہ نے کئی سو برسوں تک مختلف مذاہب کے ماننے والوں پر حکومت کی ہے۔ چنانچہ تکثیری سماجوں کے تجربہ کے معاملہ میں اسلامی تاریخ، بہت مالا مال ہے اور غالباً عہد وسطی (medieval period) کی کوئی اور تاریخ اس معاملہ میں اتنے تجربات نہیں رکھتی جتنے اسلامی تاریخ کے پاس ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ ہمارے دینی و علمی سرمائے میں ایک ہمہ تہذیبی سماج کے بہت سے مسائل ابھی بھی حل طلب ہیں۔

اس بحث کے کئی پہلو ہیں۔ سب سے اہم پہلو فکری اور تصوراتی ہے۔ ایک ہمہ تہذیبی سماج کو دیکھنے کا اسلامی زاویہ کیا ہو؟ اس کی اسلامی تھیوری کیا ہوسکتی ہے؟ ایسے سماج میں اسلامی مقصد و نصب العین کیا ہونا چاہیے؟ ریاست کے ساتھ تعلق کی نوعیت کیا ہونی چاہیے؟ سماج کی قدروں سے ہمارا رشتہ کیا ہونا چاہیے؟ ان سوالات کا ہندوستان کی اسلامی تحریک کو برسوں سے سامنا ہے۔ اور تحریک نے اپنے عمل سے ان کا جواب بھی فراہم کیا ہے لیکن جب تک یہ سوالات فکر اور نظریہ کی اونچی سطح پر ایڈریس نہیں ہوں گے الجھنیں باقی رہیں گی۔ ان الجھنوں کی سنگینی کا اندازہ ان مباحث سے ہوسکتا ہے جو گذشتہ کئی دھائیوں سے یورپ میں جاری ہیں اور جہاں ایک جداگانہ 'یورپی اسلام' (European Islam) کا تصور پیش کیا جا رہا ہے۔ ہمارے ملک کی حالیہ احتجاجی مہمات سے معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ بحثیں ہمارے ملک کے نوجوانوں میں بھی چل پڑی ہیں۔ اگر ان سوالات کو فوری ایڈریس نہیں کیا گیا تو یورپی مسلمان جس فکری بحران سے گزر رہے ہیں اندازہ یہ ہے کہ وہ بحران ہمارے ملک میں بھی درآمد ہوگا۔

بحث کا ایک پہلو فقہی ہے۔ ہمارے فقہی سرمائے کا بیشتر حصہ مسلم اکثریتی علاقوں اور زمانوں میں اور مسلمان حکومتوں کے زیر سایہ وجود میں آیا ہے۔ ایک ہمہ تہذیبی معاشرے سے متعلق بہت سے سوالات کا اطمینان بخش جواب اس سرمائے میں نہیں ملتا۔ اسی صورتِ حال نے فقہ الاقلیات جیسے مباحث کو جنم دیا ہے۔ ابھی بھی ہمارے ملک اور یہاں کے حالات کے تناظر میں یہ بحث بہت ابتدائی ہے۔ اس کو بہت کچھ آگے بڑھانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

بحث کا تیسرا اہم پہلو سماجیاتی ہے۔ یعنی ایسے سماجوں کا اسلامی نقطہ نظر سے سماجیاتی

مطالعہ، اسلامی نصوص اور سماجیات و اجتماعی نفسیات وغیرہ کے مسلمہ اصولوں کی روشنی میں ایسے سماجوں کا تحلیل و تجزیہ۔

۵۔ ایک نئے بیانیہ اور نئے اپروچ کی ضرورت

ان سب حالات کی وجہ سے اس بات کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اسلامی فکر کا بدلے ہوئے حالات سے مطابقت رکھنے والا نیا بیانیہ تشکیل پائے۔ یہ بیانیہ نئے احوال سے مطابقت رکھنے والا اور اجتہادی روح کا حامل بھی ہو اور اس معذرت خواہانہ اور مصالحت پرستانہ انداز سے بھی پاک ہو جس کا ماڈریٹ اسلام کے نام پر اس وقت غلغلہ ہے۔

اس نئے بیانیہ کی خصوصیات کیا ہوں؟ یہ بڑا اہم اور بنیادی سوال ہے۔ اس سوال پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کچھ باتیں جو اس وقت بطور مثال ذہن میں آرہی ہیں، انہیں عرض کردینا ضروری سمجھتا ہوں۔

الف) نظام یا تہذیب؟

جدیدیت نے دنیا کو نظریات اور نظاموں کی حکمرانی فراہم کی تھی۔ قومی ریاست، قوت و طاقت کا سب سے بڑا مرکز تھی۔ قومی ریاست کے اقتدار اعلیٰ (sovereignty) کا تصور جدید سیاست کا اہم ترین تصور تھا۔ ان حالات میں اسلامی مفکرین نے بجا طور پر ریاست اور سیاسی نظام کو اپنے بیانیہ کا بھی اور اسلامی نصب العین کا بھی اہم ترین عنوان قرار دیا تھا۔ بدلی ہوئی دنیا میں جبکہ سیاست کے بالکل نئے روپ سامنے آرہے ہیں، نیشن اسٹیٹ کی آہنی دیواریں تیزی سے زمین بوس ہو رہی ہیں، افکار و نظریات کے بڑے نظام معدوم ہوتے جا رہے ہیں، اور تجارتی مفادات، ٹکنالوجی کے کرشمے اور تہذیبی قدریں زیادہ تر نئی دنیا کی صورت گری کر رہی ہیں، یہ سوال نہایت اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ اسلامی فکر کی پیشکش کا موثر طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟ اقامت دین یعنی مکمل اسلامی زندگی کے خواب میں کیا اب بھی ریاست مرکزی اہمیت کی حامل ہے؟ ایک خیال یہ ہے کہ اس بدلے ہوئے دور میں تہذیب اور تمدن پر بہت زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے۔ یعنی ایک ہمہ گیر تہذیبی و تمدنی انقلاب اسلامی جدوجہد کا ہدف بنے اور اس انقلاب کے لیے درکار فکری کمک فراہم کی جائے۔ اسلام کے ایک ایسے

تہذیبی بیانیہ کو سامنے لایا جائے جس میں موجودہ دور کے اٹھائے ہوئے تہذیبی اور تمدنی سوالات کا اسلام کی روشنی میں اطمینان بخش حل فراہم کیا جائے۔

ایک فرد کے لیے خوشحال زندگی کا راستہ کیا ہے؟ خاندان اور جنسی رویوں کو کن قدروں کا پابند ہونا چاہیے؟ میڈیا اور سوشل میڈیا کی اخلاقیات کیا ہوں؟ جدید ترین ٹکنالوجی کے حوالے سے اسلامی موقف کیا ہو؟ انسانوں کی نگرانی اور ان کے حق انتخاب پر نیز ان کے ضمیر اور ان کی رائے پر ٹکنالوجی کے کنٹرول کے سلسلے میں اسلام کی رہنمائی کیا ہے؟ ٹکنالوجی کے موجودہ دور میں شہری تنظیم کے اصول کیا ہوں؟ عصری مالیاتی طریقوں کے سلسلے میں اسلامی اپروچ کیا ہو؟ فنون لطیفہ اور تفریحات کا اسلامی پیراڈائم کیا ہو؟ الگورتھم کی حکمرانی کو اسلامی فلسفہ کس نگاہ سے دیکھتا ہے؟ یہ اور اس طرح کے متعدد سوالات نہایت عمیق غور وفکر کے متقاضی ہیں۔ ان کے سلسلے میں فتوے مطلوب نہیں ہیں بلکہ گہرے سماجیاتی حل اور اطمینان بخش کلامی مباحث مطلوب ہیں۔

یہ تہذیبی بیانیہ جہاں عصر حاضر کی سوچ اور رائج طریقوں پر نقد کرے وہیں نئے رجحانات اور طریقوں کی ایجاد و اختراع کا بھی ذریعہ بنے یعنی صرف ردعمل پر مبنی (reactive) نہ ہو بلکہ اقدامی (proactive) بھی ہو۔ اس سلسلے میں سب سے اہم مثال اسلامی معاشیات کی دی جاسکتی ہے۔ اسلامی معاشیات، اسلام کے انسان دوست اصولوں اور قدروں کو روبہ کار لانے کا ایک موثر ذریعہ بن سکتا تھا۔ اسی علی گڑھ میں اسلامی معاشیات کا جو خواب دیکھا گیا تھا وہ بڑی تمدنی تبدیلی کا خواب تھا۔ لیکن اب اسلامی معاشیات دھیرے دھیرے اسلامی مالیات تک محدود ہوگئی اور اسلامی مالیات بھی، اسلام کے معاشی مقاصد کے حصول کا انقلابی ذریعہ بننے کے بجائے، جدید سرمایہ دارانہ معیشت ہی کے آلات و وسائل میں فقہی حیلوں کے سہارے اسلامی پیوند کاری تک محدود ہوکر رہ گئی۔ اس وقت جو تہذیبی چیلنج درکار ہے وہ اعلیٰ درجہ کی تخلیقی اور اجتہادی سوچ کا تقاضا کرتا ہے۔

ب) قانون یا اقدار؟

گذشتہ صدی میں قومی ریاست اور اس کا قانونی نظام، ایک ہمہ گیر قوت کے طور پر سامنے آیا تھا۔ دنیا کے سامنے یہ سوال سب سے اہم سوال بن گیا تھا کہ جدید دنیا کا قانونی نظام

کیا ہو؟ اس وقت ہمارے بزرگوں نے اسلامی شریعت اور اسلام کے قانونی نظام کو وضاحت کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اب دنیا ایک ایسے دور میں قدم رکھ رہی ہے جہاں انسانوں پر حکومتوں کے قوانین سے زیادہ غیر حکومتی عناصر (non state players) یعنی کارپوریٹ، ٹکنالوجی، میڈیا وغیرہ کا استبداد بڑھ رہا ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ اسلام کی قدریں یا جسے عصری اصطلاح میں نرم قوت (soft power) کہا جاتا ہے، اس کو نمایاں کیا جائے۔

ج) روحانی تسکین

ٹکنالوجی کے اس دور میں انسان کی بڑی ضرورت روحانی تسکین ہے۔ اس ضرورت کا بہت سی غیر اسلامی تحریکیں بری طرح استحصال کررہی ہیں۔ روحانیت کے نام سے دسیوں ادارے اب عالمی برانڈ بن چکے ہیں۔ عہد وسطی میں اسلام کی کشش کا ایک بڑا سبب اس کی روحانی طاقت تھا۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ جدید حالات و مسائل کے تناظر میں اسلام کو روحانی ارتقاء اور روحانی تسکین کے ایک موثر فلسفے کے طور پر پیش کیا جائے۔

د) مذاہب کو مخاطب کرنے کی ضرورت

بیسویں صدی کے تحریکی ڈسکورس میں اصلاً جدید نظریات کو مخاطب کیا گیا تھا۔ جیسا کہ اوپر کی سطروں میں واضح کیا گیا ہے، بدلتے ہوئے حالات میں مذہب کی اہمیت بڑھتی جارہی ہے اور مذہب پر مبنی روحانی، اخلاقی، تہذیبی اور تمدنی فلسفے دنیا کو متوجہ کررہے ہیں۔ ان حالات میں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ مذہب اور مذہبی فلسفوں کو مخاطب کیا جائے۔ عیسائیت کے ساتھ ساتھ، بدھ مت، ہندوازم، اور چین و جاپان کے مذہبی اور نیم مذہبی فلسفے، کہیں روحانیت کے نام پر، کہیں تناؤ سے پاک خوشگوار زندگی کے نام پر، کہیں ماحولیات کے تحفظ کے نام پر اور اس طرح مختلف عنوانات سے ایک نئے عالمی تمدن کی صورت گری میں اپنا کردار ادا کررہے ہیں۔ ان سب کا جواب دینا تو دور کی بات ہے، ان کا سنجیدہ، گہرا مطالعہ بھی ابھی ہماری جانب سے باقی ہے۔

خود ہمارے ملک میں قوم پرستی کے نام پر احیا پرستی اور نسل پرستی کی ایک طاقتور تحریک

غیرمعمولی، سیاسی وسماجی قوت سے مالا مال ہوچکی ہے۔ اس تحریک کے اثرات اب ہمارے ملک سے نکل کر ساری دنیا میں عام ہونے لگے ہیں۔ اس تحریک کا ایک پہلو تو سیاسی ہے لیکن ایک بہت بڑا پہلو تہذیبی، تمدنی اور سماجی ہے۔ اس تحریک کا اسلامی ریسپانس ابھی بھی وقتی سیاسی اختلاف یا اس کے اختلاف میں اٹھنے والی سیکولر آوازوں میں آواز ملانے سے آگے نہیں بڑھ پایا ہے۔ یہ صرف ہندوستان کی حد تک نہیں بلکہ عالمی سطح پر بھی اسلامی فکر کی بہت بڑی کمی ہے۔

۶۔ نئے افکار، نئے نظریات اور نئے آئیڈیاز

یہ تفصیلی بحث اس موقع پر میں نے اس لیے چھیڑی ہے کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس وقت اسلام کو درپیش فکری اور علمی چیلنج بہت بنیادی اور بہت گہرا ہے۔ ہماری ضرورتیں نہ سوالات کے فقہی جوابات اور فتووں سے پوری ہوسکتی ہیں اور نہ محض پرانی کتابوں کی باتوں کو نئی زبان میں دہرانے سے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ ہمارے اہل فکر عصر حاضر کے مسائل اور افکار و نظریات کا انتہائی گہرا مطالعہ کریں اور نئے افکار اور نئے آئیڈیاز کے ساتھ سامنے آئیں۔

ان پیچیدہ چیلنجوں کو سمجھنے اور اس کا حل تلاش کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اُن نوخیز ذہنوں سے بھی مدد لی جائے جن کی فکری توانائیاں ابھی تازہ دم ہیں اور لمحہ بہ لمحہ بدلتی ہوئی اس دنیا کی پیچیدگیوں کو جو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ اس طرح کے سیمیناروں میں نوجوان اہل علم، مرکزی یونیورسٹیوں کے نوجوان فضلاء اور طلبا کی ایک تعداد ضرور شریک ہونی چاہیے۔ عالم اسلام کے مختلف علاقوں کے حالیہ تجربات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان خواتین کو بھی جب موقع فراہم کیا جاتا ہے تو وہ غیر معمولی علمی و تحقیقی کام کرتی ہیں۔ ان کی شرکت بھی بڑھنی چاہیے۔ ▯

حواشی وحوالہ جات

[۱] یہ بحث اب بہت عام ہے اور اس کے لیے کئی حوالے دیئے جاسکتے ہیں۔ دو دلچسپ کتابیں جن سے اس بحث کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے:

i. Mounk Yascha; The People Vs. Democracy: Why our Freedom is in Danger and How to Save It? ; Harvard

University Press; Massachusetts; 2018

ii. Susskind Jamie; Future Politics; Oxford University Press; Oxford; 2018

[۲] بگ ڈاٹا سے مراد معلومات اور اعداد و شمار کا بہت بڑا ذخیرہ جس کا ترقی یافتہ کمپیوٹرز کی مدد سے تجزیہ کیا جاتا ہے اور مختلف تجارتی، حکومتی اور جاسوسی کے مقاصد حاصل کیے جاتے ہیں۔ مثلاً کسی فرد کے سوشل میڈیا، اس کی آن لائن خریداریاں، گوگل سرچ وغیرہ سے متعلق معلومات جمع کر کے اس کے رجحان اور مزاج کو معلوم کیا جاتا ہے اور اس کے لحاظ سے اس کو اشیاء فروخت کی جاتی ہیں یا اس پر سیکوریٹی ایجنسیاں نگاہ رکھتی ہیں۔

[۳] Cathy O’Neil; Weapons of Math Destruction: How Big Data increases Inequality and Threatens Democracy; New York; Crown; 2016

[۴] الگورتھم ریاضی کی ایک شاخ ہے جو کمپیوٹر پروگرامنگ کی بنیاد ہے۔ اس میں مرحلہ بہ مرحلہ ہدایات درج کی جاتی ہیں اور انہی ہدایات کو کمپیوٹر پروگرامنگ کی مدد سے روبہ عمل لایا جاتا ہے۔ الگورتھم کی حکومت سے مراد ایک ایسا نظام ہے جس میں ہدایات اور کام کے طریقے تفصیل سے طے کر لیے جاتے ہیں اور ان کو انسانی مداخلت کے بغیر مشینوں کی مدد سے روبعمل لایا جاتا ہے۔

[۵] آگمینٹڈ رینالٹی کا میڈیا میں استعمال ہوتا ہے تو ہولوگرام اور ہولولینس جیسی ترقی یافتہ ٹکنالوجی کے ذریعہ میڈیا کا مواد اس طرح سامنے لایا جاتا ہے کہ استعمال کرنے والے کے لیے یہ پیشکش حقیقی دنیا کے تجربہ (real life experience) کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ یعنی جس واقعہ کو دکھانا مقصود ہو وہ واقعہ ناظر کے سامنے پیش آنے لگتا ہے۔ تینوں ابعاد میں اس کا نظارہ، آوازیں، بو اور دیگر احساسات کے ساتھ اس کے حواس اس واقعہ کو ایک حقیقت کے طور پر محسوس کرنے لگتے ہیں۔

[۶] بلاک چین پبلک کمپیوٹر لیجرز ہیں جن میں لین دین کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ اس پیچیدہ ٹکنالوجی کی مدد سے کرپٹو کرنسی وجود میں آئی ہے۔ اس کے نتیجہ میں کسی بھی ملک کی باقاعدہ کرنسی کے استعمال کے بغیر بڑے بڑے لین دین ممکن ہو گئے ہیں۔ اس سے آئندہ مالیات،

کرنسی، ٹیکس وغیرہ کے نظاموں میں بہت سی پیچیدگیوں اور دشواریوں کا نیز اس کے نتیجے میں بڑی تبدیلیوں کا امکان ہے۔

Cathy O’Neil; Weapons of Math Destruction: How Big Data increases Inequality and Threatens Democracy; New York; Crown; 2016

[۷]Susskind Jamie; Future Politics; Oxford University Press; Oxford; 2018

[۸]Harari Yuval Noah; 21 Lessons for the 21st Century; Vintage; London; 2019 pp 13-14

[۹] Blair Tony; Why We All Must DO God in New Statesman America; 19th March 2009

[۱۰] Thomas Scott M.; The Global Resurgence of Religion and the Transformation of International Relations; Palgrave Macmillan; New York; 2005

[۱۱] Hoffmann Murad Wilfred; Religion on the Rise: Islam in the Third Millenium; Amana;Beltsville; 2001.

[۱۲] Suleiman Yasir; Narratives of Conversion to Islam in Britain: Female Perspectives; University of Cambridge in Association with The New Muslim Project; Markfield; UK; 2013

[۱۳] David Cotter and Joanna Pepin, Report “Trending Towards Traditionalism? Changes in Youths’ Gender Ideology” for Council on Contemporary Files, with reference to NewYork Times, Sunday Review 31-03-2017

[۱۴] PEW Researh Centre; The Future of World Religions:Population Growth Projections;2015; at https://assets.pewresearch.org/wp-content/uploads/sites/11/2015/03/PF_

retrieved on 19-02-2020

ملی مجلس شرعی

احتیاطی تدابیر کے ساتھ مساجد کھول دی جائیں

ملی مجلس شرعی کے سارے مکاتب فکر کے علماء کرام کا متفقہ مطالبہ

ملی مجلس شرعی جو سارے دینی مکاتب فکر کے علماء کرام کی مشترکہ علمی مجلس ہے، اس کے علماء نے کئی دن کی آن لائن مشاورت کے بعد متفقہ مؤقف اختیار کیا ہے اور حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ کرونا سے نمٹنے کے لیے احتیاطی تدابیر اور علاج کے ساتھ ساتھ رجوع الی اللہ کی ضرورت ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ مساجد کھلی رکھی جائیں اور ان میں پنجوقتہ نماز، جمعہ، تراویح، اعتکاف کی اجازت ہو، مساجد کمیٹیاں اور علماء کرام ساری احتیاطی تدابیر اختیار کریں گے۔ جب حکومت نے فیکٹریاں، کارخانے، بنک، منڈیاں کھولنے کی اجازت دے دی ہے تو مساجد پر پابندی بے جا ہے لہٰذا گرفتار علماء کو رہا کیا جائے اور مساجد پر تالہ بندی ختم کی جائے۔

علماء کرام نے کہا کہ حکومت اور اصحاب خیر غریبوں اور بے روزگاروں کی مدد کریں اور اس میں مساجد کے غریب طلبہ اور ائمہ کو بھی یاد رکھیں۔ علماء کرام نے کہا کہ خوف وہراس کی فضا ختم کی جائے، احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں، علاج کرایا جائے اور صبر اور نماز سے مدد لیتے ہوئے اللہ تعالیٰ پر یقین پختہ رکھا جائے کہ وہ اکیلا خوشی اور غم اور زندگی وموت پر قادر ہے۔ تبلیغی جماعت اور زائرین کو مجرم کی بجائے مریض سمجھا جائے۔ علماء نے کہا کہ عوام اللہ کو راضی کرنے کے لیے انفرادی اور اجتماعی سطح پر توبہ کریں اور حکمران شریعت نافذ کریں۔

جن علماء کرام نے اس قرارداد کی منظوری دی ان میں علامہ زاہد الراشدی (شیخ الحدیث جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ، مولانا عبدالمالک (صدر وفاق رابطۃ المدارس)، علامہ نیاز حسین نقوی (صدر وفاق المدارس الشیعہ)، مولانا عبدالغفار روپڑی (امیر جماعت اہلحدیث)، حافظ عاکف سعید (امیر تنظیم اسلامی پاکستان)، ڈاکٹر فرید احمد پراچہ (نائب امیر جماعت اسلامی پاکستان)، علامہ خلیل الرحمن قادری (ناظم اعلیٰ جامعہ اسلامیہ)، مولانا غضنفر عزیز (جمعیت علماء اسلام ف)، مولانا عبداللطیف چیمہ (جماعت احرار)، مولانا محمد یعقوب

شیخ (جامعہ القادسیہ)، مولانا ڈاکٹر حسن مدنی (مدیر جامعہ لاہور اسلامیہ)، مولانا جمیل الرحمن اختر (پاکستان شریعہ کونسل)، علامہ مقصود احمد (جامعہ عمر بن عبدالعزیز)، علامہ عمران طحاوی (جامع جوہر ٹاؤن) علامہ توقیر عباس (جامعہ العروۃ الوثقیٰ)، مولانا ضیاء الحق نقشبندی (صدر تنظیم اتحاد امت) و دیگر علماء کرام شامل ہیں۔ (۱۲/اپریل ۲۰۲۰ء)

تراویح کے حوالے سے

جاوید غامدی اور سندھ حکومت کی مذمت

ملی مجلس شرعی کے ناظم اعلیٰ ڈاکٹر محمد امین اور نائب ناظم اعلیٰ علامہ خلیل الرحمن قادری نے جاوید احمد غامدی کے اس بیان کی مذمت کی ہے کہ مسجد میں تراویح ادا کرنا سنت رسول نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ خود نبی کریم ﷺ نے مسجد میں تراویح ادا کیں، صحابہ کرامؓ نے پڑھیں اور امت ۱۴۴۰ سال سے پڑھتی آ رہی ہے لیکن غامدی صاحب ان سب کی نفی کر کے نیا دین ایجاد کرنا چاہتے ہیں جو امت کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔

انہوں نے سندھ حکومت کے رویے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جب مرکزی حکومت اور علماء کرام کے درمیان کچھ نکات طے ہو گئے تھے جن کی پاسداری کا یقین سندھ حکومت نے بھی دلایا تھا تو اب کیا ہوا کہ سندھ حکومت نے فیکٹریاں، کارخانے، منڈیاں، دکانیں، بنک کھولنے کی اجازت دے کر لاک ڈاؤن میں نرمی کی ہے لیکن مسجدوں کے لیے لاک ڈاؤن سخت کر دیا ہے کہ سہ پہر ۵ بجے سے صبح ۸ بجے تک کوئی آدمی گھر سے باہر نہ نکلے، مطلب یہ کہ روزہ دار فرض نمازیں اور تراویح مسجد میں ادا نہ کر سکیں۔ انہوں نے کہا کہ سندھ حکومت کو اپنے رویے پر نظر ثانی کرنی چاہیے تاکہ خدانخواستہ حالات میں کشیدگی پیدا نہ ہو۔

انہوں نے کہا کہ رمضان تقویٰ کا مہینہ ہے۔ یہ نیکیوں کا موسم بہار ہے۔ حکومت اور میڈیا کو چاہیے کہ علماء کرام کی مدد کریں تاکہ پاکستانی معاشرے میں رجوع الی اللہ کا ماحول پیدا ہو۔ لوگ دن میں روزہ رکھیں، رات کو عبادت کریں، قرآن حکیم کی زیادہ سے زیادہ تلاوت کریں اور انفاق فی سبیل اللہ سے غریبوں کی مدد کریں۔ (۲۵/اپریل ۲۰۲۰ء)

ڈاکٹر محمد امین

علماء کرام کے نام۔کھلا خط

علماء ذی وقار،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اپنے ایک خادم کا سلام قبول کیجیے۔

کرونا کے لیے احتیاطی تدابیر کے ضمن میں مساجد کھلی رکھنے کے حوالے سے راقم کی پہلے دن سے یہ رائے تھی کہ احتیاطی تدابیر کے ساتھ مساجد کھلی رکھنی چاہئیں اور بعض دیگر اہل علم کی رائے بھی یہی تھی (مثلاً سید خالد جامعی صاحب، اور یا مقبول جان صاحب، زید حامد صاحب اور بعض علماء کرام) لیکن چونکہ آپ کی اکثریت نے حکومت کا یہ فیصلہ مان لیا کہ مساجد برائے نام کھلی رہیں گی لہٰذا عمل آپ کی اور حکومت کی رائے پر ہوا۔لیکن جلد آپ نے حکومت کی غلط رائے (اور سوء نیت) کے نتائج دیکھ لیے۔اور ۱۴/اپریل ۲۰۲۰ء کو سارے مکاتب فکر کے علماء کرام نے (بڑی دینی جماعتوں کے قائدین سے مشورے کے بعد) یہ فیصلہ کرلیا کہ احتیاطی تدابیر کے ساتھ مساجد کھلی رہیں گی۔نوٹ کیجیے کہ آپ نے یہ نہیں کہا کہ ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ مساجد کو کھلا رہنے دیں بلکہ آپ نے یہ فیصلہ کردیا کہ مساجد کھلی رہیں گی۔آپ کے اس دلیرانہ فیصلے کے دو نتیجے نکلے: ایک یہ کہ مساجد کھل گئیں اور دوسرے یہ کہ حکومت آپ کے موقف کو ماننے پر مجبور ہوگئی اور اس نے آپ کی اجتماعی رائے سے تصادم مناسب نہ سمجھا۔

اس سے کیا نتیجہ نکلا؟ یہ کہ حکمرانوں میں سے جو لبرل اور سیکولر عناصر مساجد کو بند کر کے اور زائرین اور دینی مدارس کو نشانہ بنا کر اندر خانے بغلیں بجا رہے تھے کہ انہوں نے دینی عناصر کو کھڈے لائن لگا دیا ہے، آپ کے اس فیصلے سے ان کی بولتی بند ہوگئی اور حکومت آپ کے فیصلے کو ماننے اور نافذ کرنے پر مجبور ہوگئی۔

جناب عالی! یہ راقم آثم آپ کو یہ باور کرانا چاہ رہا ہے کہ اگر آپ آج بھی سچ مچ کسی مسئلے

پر متحد ہو جائیں اور اس پر سٹینڈ لے لیں تو حکومت آپ کے خلاف نہیں جا سکتی۔ ماضی میں بھی آپ کئی بار اس کا تجربہ کر چکے ہیں جیسے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینا، توہین رسالت کا قانون ختم نہ ہونے دینا، آئین میں اسلامی دفعات رکھوانا وغیرہ۔تو خدا کے لیے سوچیے کہ آپ متحد کیوں نہیں ہوتے؟ آپ میں سے کس کو نفاذ شریعت پر اختلاف ہے؟ آپ میں سے کس کو اختلاف ہے کہ سکولوں میں قرآن وسنت کی تعلیم دی جائے اور بچوں کی اسلامی تربیت کی جائے؟ آپ میں سے کس کو اختلاف ہے کہ سود پر پابندی لگائی جائے؟ آپ میں سے کس کو اختلاف ہے کہ میڈیا سے فحاشی اور عریانی ختم کی جائے؟ آپ یقین کیجیے مختلف مکاتب فکر کے درمیان مشترک امور کی کثرت ہے۔ان کے ہاں اکثر امور پر اتفاق رائے موجود ہے تو پھر سوچیے آپ متحد ہو کر یہ مطالبے کیوں نہیں اٹھاتے؟ آپ وطن عزیز میں شریعت کیوں نافذ نہیں کراتے؟

ہمیں یقین ہے آپ متحد و متفق ہو کر جو مطالبہ بھی اٹھائیں گے حکومت اس کو ماننے پر مجبور ہو جائے گی کیونکہ محب دین عوام کی اجتماعی قوت آپ کی پشت پر ہوگی۔بس اخلاص شرط ہے اور اتحاد شرط ہے۔

اے علماء کرام! ان لوگوں کے منہ بند کر دیجیے جو کہتے ہیں کہ یہ فرقہ پرست مولوی اس ملک میں نفاذ شریعت میں رکاوٹ ہیں۔ خدا کے لیے متحد ہو جایئے۔ دینی تعلیمات پر عمل کے لیے، اقامت دین کے لیے کہ اس میں مسلمانوں کی اور آپ کی بہتری ہے۔ دنیا میں کامیابی کے لیے اور آخرت میں کامیابی کے لیے۔

والسلام،

نیاز مند،

(ڈاکٹر محمد امین)

مدیر البرہان، لاہور

تفہیم مغرب

ڈاکٹر سید حسین نصر

جدید ٹیکنالوجی کے نقصانات اور مسلم دنیا

مسلم معاشرے کو اسلامی سائنس اور اسلامی ٹیکنالوجی کی طرف سنجیدہ پیش قدمی کرنی چاہیے

میں آخری شخص ہوں گا جو جدید ٹکنالوجی کو غیر جانب دار یا انسانیت کا خیر خواہ خیال کرے۔ اس مسئلے کو بحیثیت مجموعی دیکھنا ہوگا۔ جدید ٹکنالوجی کا ایک ابلیسی پہلو بھی ہے جو ابن آدم کے ظاہر و باطن دونوں کی روحانی کیفیت کو تباہ کر کے رکھ دیتا ہے۔ اس بات میں ذرا شک کی گنجائش نہیں ہے۔ مَیں آج کی گفتگو میں اس بات کو واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ جب مَیں جدید ٹیکنالوجی لینے میں ''احتیاط'' کی بات کرتا ہوں تو اس سے میری مراد یہ ہوتی ہے کہ مسلم دنیا کو جدید ٹکنالوجی کی اندھی تقلید نہیں کرنی چاہیے بلکہ جدید ٹکنالوجی پر ویسی ہی کڑی تنقیدی نگاہ رکھنے کی قابلیت پیدا کرنی چاہیے جیسی انگلستان میں ولیم میور، جان رسکن اور مغرب کے بہت سے دانشوروں نے بیسویں صدی میں اختیار کی تھی۔ افسوس! ہماری مسلم دنیا میں ٹھوس دانشوروں کی بہت کمی ہے جبکہ ہمیں ان کی سخت ضرورت ہے۔ ہمیں جدید ٹکنالوجی میں مضمر تمام خطرات سے باخبر ہونا چاہیے اور اس کی ہر بات کو بے چوں و چرا قبول نہیں کر لینا چاہیے۔ آپ نے سیل فون کی بہت اچھی مثال دی۔ سیل فون نے واقعی لاکھوں انسانوں کے ماحول کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ سیل فون نے ہماری اُس اندرونی پرسکون دنیا کو بھی تباہ کر دیا ہے جس میں ہم خدا کے ساتھ تنہا ہوتے ہیں۔ اس چھوٹے سے آلے نے ہر شخص کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ ہمہ وقت دنیا کے آفات و آلام سے پُر ہنگاموں سے اپنی زندگی کا رشتہ جوڑے رکھے۔ اور یہ کوئی اتفاقی امر نہیں ہے۔ اگر سوچا جائے تو جہاں تک روحِ انسانی پر اس کے اثرات کا تعلق ہے، اس میں بڑی گہری معنویت ہے۔

آیئے اب اس مسئلے پر ایک اور جہت سے بات کرتے ہیں۔ فرض کرو ایک فائر سٹیشن یا کسی سرکاری ایجنسی کو اپنے عملے اور متعلقہ حضرات سے فوری رابطے کی ضرورت ہے اور اُن سے کہا جائے کہ وہ اپنے پاس سیل فون نہ رکھا کریں کیونکہ اس سے رُوح کمزور پڑتی ہے تو وہ

آپ کی بات سنیں گے بھی نہیں۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ عملی سطح پر کوئی مسلم حکومت اس حل کو قبول نہیں کرے گی۔ ہم مفکر کی حیثیت سے جو کچھ کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک تنقیدی کسوٹی فراہم کر دیں اور نشان دہی کر دیں کہ کہاں کہاں احتیاط کی ضرورت ہے اور ذرا گہرائی میں جا کر جدید سائنس وٹکنالوجی کے اس پورے کارخانے کے تار و پود، اس کے مجموعی مزاج اور ماحول کے بارے میں بھی بتائیں کہ اس کا ایک ایک جز ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہے کہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ حصہ تو بہت اچھا اور کارآمد ہے اور باقی حصے برے اور بیکار ہیں۔ یقیناً صورتِ حال اس سے مختلف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید ٹکنالوجی اپنے ساتھ ایک خاص تصور کائنات، ایک خاص طرزِ زیست، ایک خاص طرزِ عمل اور ایک خاص تصورِ وقت بھی لاتی ہے۔ جدید ٹکنالوجی کے ساختہ وقت بچانے والے تمام آلات دراصل وقت کو برباد کرنے والے ہیں۔ ای میل وقت بچاتی ہے لیکن اس کی وصولی اور جواب کی ترسیل آپ کے ذہن وجسم پر دباؤ ڈالتی ہے۔ یہ ناقابل تردید حقیقت ہے۔ میں سوچ نہیں سکتا کہ اسلامی تہذیب مغربی ٹکنالوجی کا ایک اچھا حصہ اختیار کرے اور کہے کہ یہ اچھا اور کارآمد ہے اور دوسرا حصہ مسترد کرے اور کہے کہ یہ بُرا اور بیکار ہے۔ آپ جدید ٹکنالوجی کا جو بھی حصہ اختیار کریں وہ لازماً اپنے ساتھ منفی اثرات بھی لائے گا۔ بہرحال عملی سطح پر مجھے نہیں معلوم کہ تاریخ کے جاریہ حالات میں ٹکنالوجی کی کون کون سی صورتیں ترک کی جا سکتی ہیں لیکن اتنا وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہم احتیاط اور تنقیدی رویہ اختیار کریں تو حالات بدل سکتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ مغربی ٹکنالوجی کے بعض پہلو مسلم حکومتیں اختیار کر رہی ہیں۔ خواہ آپ کچھ بھی کہیں اور میں کچھ بھی کہوں۔ کاش ایسا نہ ہوتا لیکن ہو رہا ہے اور روکا نہیں جا سکتا۔ اگر روکا نہیں جا سکتا تو جدید ٹکنالوجی پر کم از کم ایک تنقیدی کسوٹی تو بٹھائی جا سکتی ہے اور جہاں تک ممکن ہو اس کے منفی اثرات کو گھٹایا جا سکتا ہے۔ کاش ہم مغربی ٹکنالوجی کو الگ رکھ کر اپنی اسلامی ٹکنالوجی کو ترقی دے سکتے جیسی ازمنۂ وسطیٰ میں ہوئی تھی۔ اگر فی الوقت ایسا ممکن نہیں ہے تو کم از کم اتنا تو کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کا ذہنی رویہ تبدیل کیا جائے اور اُنھیں آگاہ کیا جائے کہ مشینوں کی حکومت سے کیسے کیسے منفی اثرات وارد ہوتے ہیں۔ جدید اداروں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں اور بالخصوص برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں میں سائنس پرستی کا رجحان مذہبی

عقیدے کی سی پختگی کے ساتھ پایا جاتا ہے جسے دور کرنا بہت مشکل ہے۔

ہم میں اتنی جرأت تو ہونی ہی چاہیے کہ جدید سائنس کی خامیوں کی نشان دہی کر سکیں اور سائنس کی تفہیم کے لیے ایک دوسرا عقلی وروحانی فریم ورک دے سکیں۔اس کے بعد اگلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنی اسلامی سائنس کو ترقی دیں اور رائج کریں۔ یہ وہ بات ہے جو میں چالیس سال سے کہتا آ رہا ہوں۔ گویا پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنی اسلامی عقلی روایت کی جڑوں سے پیوستہ رہتے ہوئے جدید سائنس پر مکمل دسترس حاصل کریں۔ پھر اگلا قدم اسلامی فریم ورک کے اندر رکھیں، جدید سائنس کے فریم ورک کے اندر نہ رکھیں۔کوئی مسلمان طبیعیات دان یہ ہرگز نہیں کہے گا کہ وہ کوانٹم میکانیات کی دریافتوں کی پروانہیں کرتا۔ یہ فضول بات ہے۔ ضرورت جس بات کی ہے وہ یہ ہے کہ پہلے کوانٹم میکانیات کو سمجھا جائے۔ پھر اُس کی تشریح اُس طریق سے کی جائے جس طریق سے مثلاً کوپن ہیگن سکول نے کی تھی۔یعنی ڈیکارٹ کے فلسفۂ ثنویت کے اُصول پر جس کی بنیاد پر جدید سائنس کا سارا کارخانہ کھڑا کیا گیا ہے۔اگر ہم ایسا عقلی سطح پر کر سکیں اور عالم خارجی کا مستند اسلامی فلسفہ یا مابعد الطبیعیات تخلیق کر سکیں اور دوسرے یہ کہ ہم اپنی سائنسی روایت اور مغربی سائنس دونوں کے امتزاج سے عالم خارجی کی اسلامی سائنس وضع کر سکیں اور تیسرے یہ کہ مغربی سائنس کو ہم اپنی سائنسی روایت میں جذب کر سکیں تو پھر ایسی سائنس کی بنیاد پر ہمارے لیے اپنی ٹکنالوجی پیدا کرنا ممکن ہو سکے گا۔لیکن فی زمانہ دنیا کی معاشی، عسکری اور سیاسی طاقتیں اس قدر مضبوط و مستحکم ہیں کہ اگر آپ یہ کہیں کہ ''ہم جدید سائنس وٹکنالوجی کو مسترد کرتے ہیں'' تو کوئی آپ کی بات نہیں سُنے گا۔آپ ذرا موجودہ عالمِ اسلام پر نظر دوڑائیے۔ مسلم حکومتیں مغرب نواز ہوں یا بادشاہتیں یا جمہوریتیں ہوں، اسلامی انقلاب کی پیداوار ہوں یا سیکولر ہوں وہ سب جدید سائنس وٹکنالوجی کی شان میں قصیدہ خوانی میں متحد و متفق ہیں۔مسلم حکومتوں کا یہ وہ رویہ ہے جسے تبدیل ہو جانا چاہیے۔

خدا کا شکر ہے کہ گزشتہ تیس چالیس برسوں میں کچھ تبدیلی آئی ہے۔ پہلے کی نسبت کافی بہتری نظر آتی ہے جس میں ناچیز کی عاجزانہ کوششوں کا بھی کچھ حصہ ہے۔اب کم ازکم اتنا تو ہوا ہے کہ چند آوازیں اُٹھی ہیں جو کہتی ہیں کہ جس راستے پر ہم جارہے ہیں وہ صحیح نہیں ہے۔ نیز یہ کہ عقلی روایت کو جدید سائنس وٹکنالوجی پر تنقید کرنے کے قابل ہونا پڑے گا۔اگر اس دریا پر

ایک کمزور پل تعمیر کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہو تو ہمیں کم از کم یہ نہیں کہنا چاہیے کہ واہ! جدید سائنس کی کیا بات ہے۔ یہ کیسی شاندار چیز ہے! ہمیں اپنا یہ رویہ بدلنا پڑے گا۔ اگر جدید طب کو اپنانے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہو تو ہمیں کم از کم اس کی خامیوں کا احساس ہونا چاہیے اور اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنی روایتی اسلامی طب کی ترقی و ترویج کی کوشش بھی کرنی چاہیے جسے فراموش کر دیا گیا ہے۔ اور اب کہ جب چینی آکوپنکچر مغرب میں آ رہا ہے تو خوشی کی بات ہے کہ اکثر لوگ طب اسلامی کی تجدید کی باتیں بھی کرتے ہیں۔ مَیں کہتا ہوں ہمیں اپنی ذہنیت کو بدلنا ہوگا۔ اور دراصل سارے قصے میں سب سے اہم کام کی بات یہی ہے۔

مجھے محمد علی پاشا اور ایسے دوسرے حضرات سے سخت اختلاف ہے جو یہ کہتے ہیں کہ یورپ جاؤ وہاں بندوقیں بنانا سیکھو، واپس آؤ۔ بندوق بردار فوجیں کھڑی کرو اور باقی ہر چیز بھول جاؤ۔ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ دراصل تمام چیزیں اکٹھی آتی ہیں۔ بندوق سازی سے لے کر کمپیوٹر اور سیل فون بنانے کی ٹکنالوجی تک فولاد سازی، جہاز سازی یہ سب صنعتیں آتی ہیں کیونکہ ان سب کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔ ٹکنالوجی اپنا ایک تصورِ کائنات رکھتی ہے اور انسان پر عائد کرتی ہے۔ یہ انسان کو بھی ایک مشین بنا دیتی ہے۔ اسلامی تہذیب کو ہر ممکن طریقے سے کوشش کرنی چاہیے کہ وہ انسان کو مشین نہ بننے دے اور جب میں یہ کہتا ہوں کہ ہماری حکومتوں کے پاس فی الوقت ٹکنالوجی درآمد کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ یہ صورتِ حال ہمیشہ قائم رہے گی اور ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارۂ کار آئندہ بھی نہ ہوگا۔ میری تجویز یہ ہے کہ فی الحال ہم تاخیری حربے اختیار کر سکتے ہیں۔ یعنی مغربی سائنس و ٹکنالوجی کی اندھا دھند تقلید کرنے کی بجائے ہمیں یہ کرنا چاہیے کہ جہاں تقلید انتہائی ضروری ہو وہاں کی جائے اور جہاں ضروری نہ ہو وہاں نہ کی جائے۔ دریں اثنا اس مہلت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہم اپنی سائنس کی تخلیق کے لیے وقت نکال لیں اور یوں آپ دیکھیں گے کہ ایک دن ہماری اپنی ٹکنالوجی بھی ہوگی، ان شاء اللہ۔

تفہیم مغرب	سید خالد جامعی

روایتی اور مسلم معاشروں پر مغربی جدیدیت کے تباہ کن اثرات

لداخ کے بارے میں **Helena Noberg** کی کتاب **The Future of Freedom** پر تبصرہ اور تشریح

عہد حاضر کا انسان جدید تعلیم، معلومات کے انبار اور علم کے دائرے میں فرق کرنے سے قاصر ہے۔ تیسری دنیا میں تعلیم کا مطلب ہے مغرب جیسا ہو جانا۔ جو مغرب جیسا ہو جاتا ہے وہی کامیاب اور کامران ہے۔ لہٰذا علی گڑھ تحریک کی طرح تیسری دنیا پہلے مرحلے میں مغرب سے اس کی تہذیب، ثقافت، دنیا پرستی کے مظاہر ہر شعبۂ زندگی میں نہایت عقیدت اور مغلوبیت کے ساتھ قبول کر رہی ہے۔ یہ علم کا حصول نہیں غلامی کی مختلف صورتوں کا قبول عام ہے۔

حقیقی تعلیم اور علم میں اضافے کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، تاہم تیسری دنیا میں اس کا مطلب کچھ اور ہی بن گیا ہے۔ یہاں تعلیم کا مطلب بچوں کو ان کی ثقافت، فطرت، اُن کی تاریخ، تہذیب، اقدار، معاشرت، روایات، ان کے مذہب اور مابعد الطبیعیاتی اساسات سے محروم کرنا ہے۔ ان کی تربیت مغرب زدہ شہری ماحول میں تنگ ذہن ماہر کے طور پر کی جاتی ہے۔ یہ طریقہ کار خاص طور پر لداخ میں زیادہ اثر انداز ہو رہا ہے جہاں جدید تعلیمی نظام آنکھوں پر بندھی پٹی ثابت ہو رہا ہے جو بچوں کو اپنے ماحول، گردونواح، اپنے زمین و آسمان، اپنی مصنوعات، پیداوار، تخلیقات اور قدرت کی بے شمار آیات، تجلیات کے براہ راست مشاہدے سے محروم کر رہا ہے۔ جب وہ اسکول سے فارغ ہوتے ہیں تو وہ اپنے ہی وسائل کو استعمال کرنے اور سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اپنی دنیا میں کام کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ وہ تعلیم سے فراغت پاتے ہی دنیا کے ہر کام سے فارغ ہو جاتے ہیں اور کسی اچھی نوکری کا انتظار کرتے ہیں۔ ان کی پہلی اور آخری خواہش اپنے پسماندہ وطن سے نقل مکانی ہوتی ہے۔

مدرسوں میں دی جانے والی مذہبی تربیت کے سوا لداخ کے روایتی نظام میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے جس کو آپ مغرب کی اصطلاح میں تعلیم کہہ سکیں۔ تعلیم فرد کے اپنی برادری اور ماحول کے ساتھ یگانگت کے لافانی رشتے کے نتیجے میں ظہور پذیر ہونے والے عمل،

حکمت اور جامعیت کا نام ہے۔ مغرب کی اصطلاح کے مطابق تعلیم نہ دی جائے تو وہ تعلیم جہالت بن جاتی ہے۔ مغرب کے سوا پوری دنیا جاہل ہے لہٰذا جب تک دنیا مغرب کے بتائے ہوئے طریقے سے تعلیم حاصل نہ کرے وہ جاہل ہے۔ مغرب سب کو اپنی طرح تعلیم یافتہ بنانا چاہتا ہے۔ اسے سفید آدمی کا بوجھ (White Man's Burden) کہا جاتا ہے۔ وہ اپنا بوجھ پوری دنیا پر لادنا چاہتا ہے۔ جدید سیکولر اسکول کھلنے سے پہلے لداخ میں بچے اپنے دادا دادی، نانا نانی، خاندان، دوستوں، رشتے داروں، بڑوں، بزرگوں اور قدرتی ماحول سے عقلی علوم حاصل کرتے، دانشِ آبائی سیکھتے، ہنر حاصل کرتے اور متنوع میدان ہائے علم کی معلومات و تجربات بلا معاوضہ فطری طریقے سے حاصل کرتے تھے مگر جدید نظام تعلیم میں حصول علوم کے ان روایتی، عملی، فطری طریقوں کو علم نہیں جہالت ثابت کیا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر بیج بونے میں مدد کے دوران انہیں تجربے سے بخوبی معلوم ہوتا تھا کہ گاؤں کا ایک حصہ گرم اور ایک حصہ ٹھنڈا ہے۔ بچے اپنے تجربے سے جَو [Barley] کی مختلف اقسام کے درمیان فرق سمجھتے ہیں اور ہر قسم کی افزائش کے موسم کا اندازہ لگاتے ہیں۔ وہ چھوٹے سے چھوٹے پودے کی شناخت کر سکتے ہیں، نیز یہ بھی جانتے ہیں کہ کسی خاص جانور کو کس طرح پہاڑیوں پر چڑھانا ہے۔ وہ روابط، عمل، تبدیلی اور ان کے درمیان تبدیل ہوتے تعلق کو سیکھتے ہیں۔

جیسے جیسے جدید سیکولر لبرل تعلیم بھارت، تبت، لداخ، پاکستان جیسے روایتی علاقوں میں عام ہو رہی ہے اور جڑ پکڑ رہی ہے اس کے نتیجے میں گاؤں دیہاتوں میں کھیتی باڑی کے لیے نہ کسان دستیاب ہیں نہ جانوروں کو چرا گاہوں تک لے جانے کے لیے بچے میسر ہیں۔ یہ سب کام کون کرے گا؟ ملٹی نیشنل کارپوریشن، حکومت یا این جی اوز۔ کیا یہ تمام کام علم نہیں، معیشت نہیں، ضروریات زندگی کے لیے لازم نہیں؟ جدید تعلیم روایتی انسان کو ان تمام حقیقی امور بلکہ ضروریات زندگی تک سے لاتعلق کرتی ہے اور ان کاموں کو غلط، بے کار اور حقیر ٹھہرا دیتی ہے۔ اور ان کا حل یہ پیش کرتی ہے کہ پیسے کماؤ اور بازار سے جا کر ملٹی نیشنل کارپوریشنوں سے ضرورت کی چیزیں خرید لو۔ ان کو اگانے، پیدا کرنے، محنت کرنے اور وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور جدید انسان ان باتوں کو تسلیم کر لیتا ہے لہٰذا اسے اپنی گائے کے تھن سے

دودھ نکالنا، اپنے گھر میں سبزی پھول اگانا، اپنے ہاتھ سے مکھن بلونا، جانور کو چرانا، اس کی گندگی اٹھانا، اپنے کھیت میں فصل اور پھل لگانا احمقانہ کام نظر آتا ہے۔ وہ اب جاہل نہیں ہے وہ بہت مہذب (civilized) ہوگیا ہے۔

روایتی تہذیبوں اور قدیم معاشروں کی طرح لداخ میں بھی تعلیم زندگی سے جڑی ہوئی اور اس حقیقی زندگی سے نکلی ہوئی ایک روایت تھی جس کے لیے اربوں کھربوں کی عمارتیں کتابیں، تنخواہیں اور غیر ملکی امداد کی ضرورت نہ تھی۔ جدید تعلیم گاہوں کی طرح نظری علم سے زیادہ عملی علم روایتی معاشروں کا طریقہ تھا اور لداخ میں آج بھی موجود ہے۔ فطرت کے مکتب، بزرگوں کی صحبت، ماہرین فنون کی رہ نمائی میں ایک بچہ اخلاق، آداب، تہذیب کے بندھنوں میں یہ تعلیم بغیر کسی معاوضے، دور دراز کے سفر سے بچتے ہوئے اپنے گردونواح میں اپنے ہی بزرگوں سے بہترین طریقے پر حاصل کرتا تھا۔

لداخی نسلوں سے یہ جانتے ہیں کہ کس طرح اپنے لیے خوراک، ضروریات زندگی، کپڑے اور مکان کا انتظام کرنا ہے۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ یاک کی کھال سے جوتے کیسے بنائے جاتے ہیں اور بھیڑ کی کھال سے اون اور دھاگے کیسے تیار کیے جاتے ہیں۔ پتھر اور مٹی کے گھر کس طرح تعمیر ہوتے ہیں۔ تعلیم محل وقوع سے مخصوص اور ماحول میں موجود زندہ اجسام کے ساتھ محبت کے تعلق کے ساتھ دی جاتی تھی۔ یہ بچوں کو وجدان کا شعور عطا کرتی تھی، اور جیسے جیسے وہ بڑے ہوتے جاتے تھے ان کو اپنے اردگرد موجود، میسر، دستیاب تمام قدرتی، انسانی، مصنوعی، تخلیقی وسائل کے مؤثر استعمال کا شعور آجاتا تھا۔

یہ علم ان میں اعتماد، اپنے آپ پر انحصار اور دوسروں سے بے نیازی کا رویہ سکھاتا تھا۔ اس روایتی علم کو حاصل کرنے والے کسی سے قرضہ، بھیک، خیرات [Loan/grant/aid] نہیں مانگتے تھے وہ خود کفیل معیشت رکھتے تھے۔ اس تعلیم، تدریس، تربیت کے نتیجے میں ان میں دوسروں کی طرف دیکھنے اور امداد، خیرات مانگنے کی بجائے خود انحصاری اور خودنگری کا حقیقی مزاج بھی پیدا ہوتا تھا اس طرح کا کوئی علم جدید، لبرل، سیکولر اسکولوں میں نہیں دیا جاتا۔ بچوں کو مغربی، یورپی ٹیکنالوجی کے معاشرے کے متعلق سکھایا جاتا ہے نہ کہ ماحولیاتی معاشرے

کے متعلق جو بچے کے سامنے موجود ہے۔ ٹیکنالوجیکل معاشرے میں فرد کوئی کام نہیں کرتا، ہر کام مشین کرتی ہے اور ہر چیز پیسے سے ملتی ہے۔ دوسرے معنوں میں آپ کارپوریشنوں کے غلام بن جاتے ہیں۔ آپ صرف ایک صارف (consumer) ہوتے ہیں۔ آپ کچھ پیدا نہیں کرتے، آپ صرف سرمایہ (Capital) اپنے لیے پیدا کرتے ہیں تاکہ وہ سب چیزیں بازار سے خرید سکیں جو روایتی معاشروں کے صحن، چاردیواری اور گردونواح میں موجود تھیں۔

عہد حاضر میں اسکول وہ مقام بن گیا ہے جہاں بچے روایتی مہارتوں کو بھول جاتے ہیں بلکہ افسوس ناک بات یہ کہ وہ اپنے ہی علوم وفنون کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ لداخ سے لے کر تھرپارکر تک اور پاکستان کے شمالی علاقہ جات، قبائلی اور سرحدی علاقوں میں یہی صورت حال ہے۔ روایتی معاشروں کے بچے جدید بننے کے لیے مغرب کی مہیا کردہ ان بے کار مہارتوں کے حصول کی کوشش کرتے ہیں جو مغرب کی ایجاد ہیں اور قرضے، بھیک، خیرات، امداد کے بغیر ان کا حصول ناممکن ہے۔ یہ جدید نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کا لازمی نتیجہ ہے جو اسی مقصد کے حصول کے لیے تخلیق کیا گیا ہے کہ اپنی تاریخ، اپنے موسم، اپنے آبائی علاقوں، اپنے علوم وفنون، روایات، مہارتوں، اوزار، آلات کو مسترد کردو اور مغربی علوم وٹکنالوجی کو اختیار کرکے مغرب جیسے ہوجاؤ۔

لداخ کے بچوں کو اب اپنے موسم، ماحول، پھولوں، پھلوں، درختوں، پودوں، جڑی بوٹیوں، نباتات، حیوانات، قدرتی وسائل، تاریخ، اقدار، روایات کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ وہ ہواؤں میں بدلتے موسم کا منظر محسوس نہیں کرتے، نہ اب ستارے ان کو راستہ بتاسکتے ہیں حالانکہ اندھیری راتوں میں ہزاروں سال سے ستارے راستہ بتارہے تھے لیکن اس کے لیے ایک خاص علم، مہارت، محنت، مشق اور تجربے کی ضرورت ہے۔ ماحولیات سے غیر متعلق جدید سیکولر لبرل تعلیم آیاتِ کائنات سے بھی انسان کو غیر متعلق کردیتی ہے لہٰذا ایک چمکتا ہوا تارہ جدید انسان کے لیے بس ایک جمالیاتی وجود کے سوا کچھ نہیں، بس اچھا لگتا ہے۔ اس کا ہدایت، رہنمائی، اندھیروں میں دستگیری سے کوئی تعلق نہیں رہ گیا۔ یہی صورت حال ایشیاء وافریقا کے تمام ترقی پذیر ممالک کو درپیش ہے۔ سب اپنی تاریخ، ماحول اور موجود سے منقطع ہوچکے ہیں۔ یہ کام نہایت سلیقے، قرینے سے، طریقے سے، نہایت نرمی، محبت، ہمدردی

کے ساتھ جدید تعلیم کرتی ہے۔اسے [Soft policy] کہتے ہیں یعنی کسی قوم پر تہذیبی، علمی، ثقافتی یلغار اور خاموش انقلاب کے ذریعے قبضہ۔ کیوں کہ کسی تہذیب کی علمیت کو شکست دیے بغیر دوسری تہذیب کی علمیت کا غلبہ کبھی ممکن نہیں ہوتا۔

لداخی اسکولوں میں مغربی تعلیم ۱۹۷۰ء کی دہائی میں آئی تھی۔ اب یہاں پر تقریباً سو اسکول موجود ہیں۔ بنیادی نصاب ہندوستان میں پڑھائے جانے والے نصاب کی ناقص نقل ہے جو خود برطانوی نظام تعلیم کی نقل ہے۔ نقل در نقل نظام تعلیم بچوں میں تخلیقی صفات پیدا کرنے سے قاصر اور صدیوں کی دانش وبینش اور گہرائی وگیرائی جدید نسل میں منتقل کرنے سے عاجز ہے۔ اس میں لداخ کے حوالے سے کچھ بھی نہیں ہے۔

لداخی طلبہ اسکول میں جو کچھ بھی پڑھتے ہیں اس علم کا ان کی حقیقی، واقعی، جیتی جاگتی، دوڑتی بھاگتی، عام زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے، نہ اس نظری علم کا کوئی عملی فائدہ ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ نیویارک، ایران یا برلن کے شہریوں کے لیے تیار کردہ نصاب پڑھتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کا تحریر کردہ نصاب پڑھنے پر مجبور ہیں جنہوں نے لداخ میں کبھی قدم بھی نہیں رکھا جو ۱۲،۰۰۰ فٹ پر جَو [Barley] اگانے اور سورج سے خشک کرکے بنائی جانے والی اینٹوں کے مکانات کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے۔

یہ معاملہ صرف لداخ کے ساتھ نہیں ہے، وہ عمل جس کو تعلیم کا نام دیا گیا ہے وہ یکساں در آمدی طرز تعلیم کے ماڈل (Eurocentric Model of Education) پر مشتمل ہے۔ اس کا محور کائنات کے علم (Univerasal knowledge) سے متعلق دور دراز کے اعداد وشمار ہیں۔ جدید نصابی کتابیں ایسی معلومات کی ترویج کرتی ہیں جو پورے سیارے [Plannet] کے لیے کارآمد ہوسکیں۔ یہ تصور بھی محض خیالی [Utopia] ہے۔ ایک سی تعلیم اسی وقت فائدہ مند ہے جب دنیا بھر میں موسم بھی ایک ہو، ماحول بھی ایک ہو اور ضروریات زندگی بھی یکساں ہوں اور لوگ بھی بالکل ایک جیسے ہوں۔ سب لوگوں کو ایک طرح کی تعلیم دینا، ایک طرح کی خوراک کارپوریشن اداروں کے ذریعے مہیا کرنا، ایک طرح کے طریقے، طرز زندگی، معیشت سکھانا اصلاً عالمگیر نوآبادیاتی نظام [Universal colonization]

اور لوگوں کے ذہنوں کو شاہ دولہ کے چوہے بنا کر نوآبادی کے غلام بنا کر [Colonize] کرنا ہے۔

بلوچستان کی مثال

بلوچستان کے ایک علاقے آواران میں چند سال پہلے زلزلہ آیا۔ امدادی ٹیم گئی تو معلوم ہوا کہ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ گھر سیدھے سادے قدرتی اشیاء کے بنے ہوئے تھے ان کے گرنے سے کوئی جانی نقصان نہ ہوا۔ امدادی ٹیم سامان لے کر گئی تو کوئی دوڑ کر چھیننے، جھپٹنے، لوٹنے کے لیے نہیں آیا سب لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ ایک جگہ جو ڈھیر ہے یہ تمام سامان وہاں رکھ دیں۔ ہمارے علاقے کا طریقہ یہ ہے کہ کوئی سامان گھر لے جا کر جمع نہیں کرتا۔ سامان ایک جگہ اکٹھا کر دیا جاتا ہے جس کو جو ضرورت ہوتی ہے وہ یہاں سے لے جاتا ہے۔ بچوں کو نقد پیسے دیے گئے مگر وہ لینے کے لیے تیار نہ تھے۔ زبردستی پیسے دیے گئے تو وہ رقم اپنی ماؤں کو دے کر واپس آ گئے۔ کسی نے دوبارہ پیسے نہیں مانگے۔ علاقے میں زمین سخت گرم تھی اتنی گرم کہ ٹیم کے اراکین جو ملٹی نیشنل کمپنیوں کی چپلیں جوتے پہنے ہوئے تھے گرمی سے پریشان تھے۔ مقامی لوگ مقامی اشیاء سے بنی ہوئی مقامی چپلیں پہنتے ہیں جب وہ چپلیں پہنی گئیں تو وہ بالکل ٹھنڈی تھیں۔ چند سال بعد یہاں یہ مقامی چپلیں ختم ہو جائیں گی کیوں کہ یکساں استعماری تعلیم اور یکساں استعماری معیشت کے ساتھ جسے اپنے آفاقی [Universal] ہونے کا جھوٹا دعویٰ ہے، مغرب کا تخلیق کردہ یکساں طرز زندگی بھی مسلط ہوگا۔ اس کو مغرب تنوع [Diversity] کہتا ہے وہاں یکسانیت [Uniformity] تنوع کی مترادف ہے۔ مارکیٹ کا جبر ان روایتی چپلوں کو خود ختم کر دے گا۔ ریاست اس جبر کو روکنے کے لیے کچھ نہیں کرے گی جس طرح قدیم مشروبات ختم کیے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ کوک اور پیپسی لے رہی ہے۔

ہم نے اپنی زندگی میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ مارکیٹ کے جبر نے بلبلے بنانے والی روایتی کاری گری [Technique] کو ختم کر کے عام آدمی کا روزگار چھین کر اس گھریلو صنعت کو ختم کر کے ڈیڑھ سو روپے میں بلبلے والی مشین بنا دی ہے جو پلاسٹک کی ہے جس کی

مشین درآمد ہوتی ہے، زرمبادلہ ضائع ہوتا ہے، آلودگی پھیلتی ہے اور جسے ہر کوئی خرید نہیں سکتا۔ پہلے غریب لوگ لوہے کے تار اور ڈنڈی سے بلبلے بنانے والی دیسی مشین پانچ دس روپے میں بنا کر بیچتے تھے۔ یہ روزگار تھا اور سستی چیز میسر تھی۔ ہر بچہ اسے استعمال کر سکتا تھا اب تو اس مشین کو خریدنا سب کے لیے ممکن نہیں۔ جلدی ٹوٹ جاتی ہے پلاسٹک کا کوڑا پیدا کرتی ہے اور کام وہی کرتی ہے جو ایک عام آدمی اپنی مشین سے لیتا تھا۔ یہ ہے سرمایہ اور مارکیٹ کا جبر جس سے ہم واقف ہی نہیں ہیں اور مسلسل اس نظام کی عظمت کے ترانے گائے جا رہے ہیں۔

میرے ایک عزیز دوست جو اس قافلے میں شامل تھے جب وہ بلوچستان کے زلزلہ زدہ علاقے آواران کے بچوں کے اخلاق، بے غرضی، دنیا سے لاتعلقی کی کہانی سنا رہے تھے تو راقم نے بے ساختہ کہا میرا خیال ہے کہ وہاں اسکول نہیں ہوں گے کیوں کہ اسکول کی تعلیم سے اتنے مہذب بچے نہیں نکل سکتے جو اپنی اقدار، روایات کے جامع ہوں۔ ان کو حیرت ہوئی کہنے لگے آپ کو کیسے پتہ چلا۔ واقعی اس علاقے میں ابھی تک کوئی اسکول نہیں ہے۔ کراچی کے تمام اچھے بڑے سیکولر اور مذہبی سیکولر اسکولوں میں بھی بچوں کو سختی سے یہ سبق دیا جاتا ہے کہ اپنا کھانا، اشیائے خورونوش کسی دوسرے بچے کو نہ دیں۔ وقفے میں سب بچے مل بیٹھ کر ایک دسترخوان پر نہیں کھاتے، الگ الگ کھاتے ہیں۔ اس ماحول سے نکلنے والا بچہ ایک مفاد پرست شخص ہی ہو سکتا ہے۔

وہ علم جسے عالم گیر طور پر قابل قبول علم کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے، مخصوص ثقافت اور ماحول سے لاتعلق کر دیا گیا ہے بلکہ یہ ایک تجریدی [Abstract] پیچیدہ اور لایعنی علم ہے جس کا دنیا کے اکثریتی علاقے کی حقیقی زندگی سے ذرہ برابر بھی تعلق نہیں۔ یہ علم اور جدید سیکولر تعلیم جو ایک خاص تہذیب اور خاص ثقافت اور ایک خاص تاریخی تجربے کے نتیجے میں اٹھارہویں صدی کے مغرب میں پیدا ہوا جو اپنے تاریخی، روایتی، مذہبی معاشرے کی اقدار سے بغاوت کر کے ایک جدید، الحادی، مادہ پرستانہ تہذیب کی بنیاد رکھ رہا تھا جو انسانی انفرادی آزادی، لذت پرستی، ترقی اور انسان پرستی کے جدید خداؤں کی پرستش کے لیے تخلیق کیا گیا تھا۔ جدید تعلیم انہی مقاصد کی ترجمان ہے ایک خاص تاریخ و تہذیب سے نکلنے والے نظام تعلیم کو دنیا نے اکثر جبر اور بہت سے مقامات پر تابعدار غلاموں کی نیازمندی کے ذریعے قبول کر لیا ہے لہٰذا اس تجریدی نظام اور نصاب تعلیم کو ذہنی غلاموں نے ایک آفاقی نظام تعلیم کے طور پر تسلیم کر لیا

ہے۔اس نظام سے نکلنے والی نسل کو تباہی سے روکنے والی کوئی قوت سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔مغرب کے حامی اوراس کے دشمن بھی اس نظام کو عالمی، آفاقی، غیر اقداری اور تخلیقیر وایات کا حامل نظام تسلیم کر چکے ہیں۔اندھیرا جب اس حد تک چھا جائے کہ وہی روشنی کا متبادل بن جائے تو زوال کی رات مزید گہری ہوجاتی ہے۔پوری دنیا اور خصوصاً مشرق وسطیٰ، افریقا، ایشیا تیزی سے زوال کی اس رات کی سیاہی میں مزید اضافہ کررہے ہیں۔ایسی صورت حال میں بچے جو کچھ پڑھ رہے ہیں وہ بالکل مصنوعی ہے اور زندگی کے حقیقی تناظر سے دور ہے۔

لداخ کے بچے جب اعلیٰ تعلیم کی طرف جاتے ہیں تو مکان تعمیر کرنا سیکھتے ہیں لیکن یہ تعمیر سیمنٹ اور لوہے کے Universal boxes کی شکل میں سیکھتے ہیں۔یہ چیزیں ان کے اردگرد موجود نہیں لہٰذا یہ درآمد ہوں گی۔اسی طرح اگر وہ زراعت کا علم حاصل کرتے ہیں تو وہ صنعتی، کاشتکاری، کیمیائی کھادوں اور کیڑے مار دواؤں (Pesticides)، بڑی بڑی مشینوں اور مخلوط بیجوں کے متعلق پڑھتے ہیں۔روایتی کاشت کاری خود انحصاری پر مبنی تھی، مشینی کاشت کاری صرف خریداری اور بہت بڑے پیمانے پر درآمدات [Import] پر مبنی ہے۔اس کے نتیجے میں ان کی خودمختار، خودانحصار معیشت روایتی معیشت کے دائرے سے نکل کر جدید سرمایہ کی معیشت [Capital Economy] میں تبدیل ہوگئی ہے جہاں سرمایہ اور پیسے کے بغیر زندگی گزاری نہیں جاسکتی۔روایتی معاشروں میں پیسے کا عمل دخل بہت کم تھا، لوگ خود کفیل ہوتے تھے اور اشیاء کا تبادلہ ہوتا تھا۔صرف عیش کرنے کے لیے پیسے کی ضرورت ہوتی تھی حقیقی ضروریات زندگی کے لیے پیسے کی ضرورت نہ تھی حتیٰ کہ لداخ میں لوگ بالکل صحت مند تھے کوئی بیمار نہیں تھا۔Helena Noberg نے جب لداخیوں کو بتایا کہ مغربی ممالک میں سب لوگ ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں تو ان کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔یعنی لداخ میں بیماری، ہسپتال، ڈاکٹر، ایک حیران کن بات تھی۔

پاکستان کے شمالی علاقے

کچھ یہی صورت حال بی بی سی کے براڈ کاسٹر رضا علی عابدی کو ۱۹۹۵ء میں درپیش ہوئی جب وہ ریڈیو سے اپنا سفرنامہ ''شیر دریا'' پیش کررہے تھے۔یہ سفرنامہ سنگ میل پبلی کیشنز

لاہور نے شائع کیا ہے۔اس سفر کے دوران وہ چلاس پہنچے جہاں کی آبادی تین لاکھ تھی۔ پوری وادی میں نہ ڈاکٹر، نہ ہسپتال، نہ میٹرنٹی ہوم۔ انھیں حیرت ہوئی کہ بچے کیسے پیدا ہوتے ہوں گے کیوں کہ جدید انسان یہی سمجھتا ہے کہ دفتر کے بغیر کام نہیں ہوسکتا۔گاڑی کے بغیر سفر کیسے ممکن ہے۔صابن کے بغیر صبح نہیں ہوسکتی۔ٹوتھ پیسٹ کے بغیر دانت کیسے صاف ہوں گے۔ اور میٹرنٹی ہوم کے بغیر بچے کیسے پیدا ہوں گے کیونکہ وہ اپنی تاریخ، تجربے، زمان ومکان کا قیدی ہے اس سے ماورا ہوکر سوچ ہی نہیں سکتا حالانکہ تاریخ کے دو پیغمبر قرآن کے مطابق میٹرنٹی ہوم کے بغیر پیدا ہوئے حضرت موسیٰؑ حضرت عیسیٰؑ اور آخری پیمبر کی ولادت بھی تاریخ کے مطابق میٹرنٹی ہوم کے بغیر ہوئی۔آج بھی دنیا میں اربوں جانور، پرندے، درندے، چرندے،حشرات الارض ہاتھی اونٹ کے بڑے بڑے بچے بھی فطری طریقے سے میٹرنٹی ہوم کے بغیر پیدا ہوتے ہیں۔

چلاس کے ڈپٹی کمشنر کی بیگم ڈاکٹر تھیں اور گھر پر لوگوں کا علاج وغیرہ کرتی تھیں۔رضا علی عابدی نے ان کا انٹرویو لیا تو انھوں نے بتایا یہاں کی عورتوں کی صحت بالکل ٹھیک ہے، بالکل دبلی پتلی ہوتی ہیں۔صحت کا راز یہ ہے کہ صبح سے رات تک گھر کے کام کرتی رہتی ہیں۔ایک ایک عورت کے دس بارہ بچے ہوتے ہیں۔فطری زندگی بسر کرنے والوں کے بچے بھی فطری طریقے سے پیدا ہوتے ہیں۔ظاہر ہے عہد حاضر کے جدید انسان کے لیے یہ باتیں حیران کن بلکہ ناقابل یقین ہیں۔

اس کے برعکس مغرب کا بہت بڑا فلسفی رچرڈ رارٹی جو لداخ جیسے فطری علاقے میں نہیں بلکہ جدید مغرب کے جدید ملک امریکہ میں پیدا ہوا جہاں کوئی بیماری، ہسپتال، ڈاکٹر کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔مغرب میں ہر شخص دو تین چار بیماریوں میں مبتلا ہوتا ہے۔ہر شخص ماہر نفسیات اور Therapist سے رجوع کرتا ہے۔معروف کتاب Habbits of the Heart پڑھ لیجیے۔ہر شخص میڈیکل انشورنس کرانے پر مجبور ہے،لہٰذا رچرڈ رارٹی اپنی ایک تقریر میں یہ سوال اٹھاتا ہے۔

Every body agrees it is absolutely wrong to refuse sick children medical help,but no body agrees on how the doctor's

bill is to be paid.

ظاہر ہے رچرڈ رارٹی جس تاریخ وتہذیب میں پیدا ہوا ہے وہاں بہت سے لوگ، بیمار، نفسیاتی مریض اور پاگل ہوتے ہیں لہٰذا ہر شہر میں پاگل خانہ موجود ہے۔ یہ اس کا ذاتی، مقامی، قومی تجربہ ہے مگر وہ اسے ایک آفاقی حقیقت سمجھتا ہے۔ لیکن دنیا بھر میں صورت حال ایسی نہیں ہے۔ فطری زندگی بسر کرنے والے کئی علاقوں میں آج بھی لوگ بالکل صحت مند ہیں۔ لداخ کی مثال ایسے ہی علاقوں میں سے ایک علاقے کی ہے۔ جس انسان کے تجربات تک مختلف ہیں اس انسان کے لیے دنیا بھر میں یکساں نظام تعلیم، نظام معیشت، نظام سیاست اور نظام معاشرت کا جبری تسلط بدترین بہیمیت ہی نہیں عقل مندی کے بھی خلاف ہے۔ لیکن لبرل ازم آفاقیت کے نام پر اس بہیمیت کا قائل ہے۔ وہ ساری دنیا کو اپنی تعلیم، تہذیب، ثقافت، معیشت میں جبراً رنگنا چاہتا ہے کیوں کہ وہ اسے قطعی اور الحق سمجھتا ہے۔ مغرب تمام سچائیوں کا انکار کرتا ہے مگر خود اپنے بیانیوں (Mega Narratives) کو آفاقی دعووں کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ وہ ان دعووں پر پوسٹ ماڈرن ازم کی نہایت عاقلانہ تنقید کو بھی تسلیم نہیں کرتا۔

یہ روایتی معاشرہ جو اٹھارویں صدی میں جدید صنعتی سائنسی سرمایہ دارانہ ترقی سے پہلے پوری دنیا میں زندہ وتوانا تھا، لداخ میں ۱۹۷۵ء تک نہایت کامیابی سے چل رہا تھا۔ لوگ خوش حال اور مطمئن تھے مگر اب بدحال ہیں۔

۱۹۷۵ء میں لداخ میں کوئی غریب نہیں تھا آج وہاں کوئی امیر نہیں ہے کیوں کہ پیمانے بدل گئے ہیں۔ جدید تعلیم سب سے پہلا کام یہ کرتی ہے کہ وہ دنیا کی ہر تہذیب، معاشرت، مذہب کی مابعد الطبیعیاتی اساسات کو بدلتی ہے تاکہ سوچنے، سمجھنے، برتنے اور جاننے پرکھنے کے پیمانے بدل جائیں۔ اب غربت وامارت کو ناپنے کا پیمانہ لداخی تہذیب یا ان کے مذہب اوران کے زمین وآسمان سے نہیں بلکہ مغرب سے آتا ہے۔ پیمانہ بدل جائے تو جو شے کل تک سیدھی تھی آج الٹی نظر آتی ہے۔ لداخی کل تک اپنے پیمانے کے مطابق امیر تھے جیسے ہی جدید تعلیم اور میڈیا کے ذریعے انہوں نے مغرب کا پیمانہ لیا وہ فوراً غریب ہو گئے اور اب ترقی کے ذریعے اپنی غربت دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں حالانکہ اسی ترقی نے ان کو فی الحقیقت غریب کر دیا ہے اب وہ ہمیشہ غریب ہی رہیں گے۔

تیسری دنیا اور جنوب (South) کے تمام ملکوں کی کہانی لداخ کی کہانی میں سموئی ہوئی ہے۔ آج لداخ والے خود کو سب سے زیادہ غریب اور دنیا کا سب سے زیادہ محروم طبقہ تصور کرتے ہیں۔ یہ تعلیم اور میڈیا کے ذریعہ فکر ونظر کے سانچوں کو تبدیل کر دینے کا فطری نتیجہ ہے۔ جدید سیکولر تعلیم آپ کے سوچنے سمجھنے کے پیمانے بدل دیتی ہے حتیٰ کہ آپ کے سونے جاگنے کے اوقات، کھانے پینے کی عادتیں، محبت ونفرت کے پیمانے حتیٰ کہ آپ کے خواب، خیال، تصورات، اقدار، روایات بلکہ خوشبو اور بدبو کے پیمانے بھی بدل دیتی ہے۔ کراچی میں آپ کسی بچے کو دیسی گھی کھلائیں تو وہ کہے گا اس گھی سے بدبو آرہی ہے کیوں کہ اس بچے نے ڈالڈا کا نقلی گھی کھایا ہے جو خوشبو سے خالی ہے۔ مغربی نظام تعلیم ہمیں سب سے زیادہ ناقص بنا رہا ہے، یہ پوری دنیا کے لوگوں کو عالم گیر سطح پر یکساں وسائل کے استعمال کی تبلیغ کرتا ہے اور اس میں ان وسائل کو کلی طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے جو مختلف معاشروں کو ان کے ماحول سے قدرتی طور پر ملتے ہیں۔ پاکستان، بنگلہ دیش، سری لنکا، بھارت اور لداخ کے بہت سے علاقوں میں آج بھی لوگ اپنے ہاتھ سے چپّل جوتے ہی نہیں بنیادی ضروریات کی تمام اشیاء اپنے لیے خود پیدا کرتے ہیں اور خام مال سے ضرورت کی تمام چیزیں خود بناتے ہیں مگر یہ ہنر اعلیٰ تعلیم آنے کے بعد ختم ہوجائیں گے پھر جوتے، غذائیں دودھ، دال، چاول اور تمام اشیائے ضروریات درآمد کیے جائیں گے۔ جدیدیت اور جدید تعلیم علاقائی، جغرافیائی اور حقیقی معیشت [Real Economy] سے فرد کا رشتہ توڑ کر اسے تعلیم کے ذریعے ایک آفاقی معیشت کا خواب دکھاتی ہے جس میں انسان کسی صنعت یا سروس سیکٹر میں غلامی کا فریضہ انجام دیتا ہے اور اس پر راضی رہتا ہے۔ آفاقیت کے نام پر یہ عالمی کالونائزیشن [Universal Colonization] کا منصوبہ ہے جس کی کسی سطح پر کوئی مزاحمت نہیں ہے۔

Three cups of Tea کے جاہل غبی مصنف کو دنیا کی ۱۸ یونیورسٹیوں نے تعلیم میں پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری اسی لیے دی کہ اس نے شمالی علاقہ جات کے ان مذہبی روایتی علاقوں میں سیکولر تعلیم کے سکول کھول دیے جہاں ان کی اجازت نہ تھی اور جہاں کی تہذیب، معاشرت، معیشت سے اس تعلیم کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس نے سب سے پہلے ایک شیعہ عالم دین کو اس کام پر آمادہ کیا۔ جیسے ہی شیعہ علاقے میں سیکولر تعلیم کے اسکول کھلے سنّی علاقوں نے

یہ سمجھا کہ وہ ہم سے آگے نکل جائیں گے لہٰذا ان کے علاقے میں بھی اس طرح کے سکول کھل گئے۔ جو کام امریکی فوج نہیں کرسکی وہ کام ایک جاہل آدمی نے کرڈالا۔ اب ان علاقوں میں تعلیم حاصل کرنے والے تیزی سے شہر منتقل ہورہے ہیں۔ جدید سیکولر تعلیم ان کی اقدار، روایات، رویے، طرز زندگی سب کچھ تہس نہس کررہی ہے اور لوگوں کو ان کی جڑوں سے اکھاڑ کر شہروں کی طرف ہانک کر ان پچاس منزلہ ڈربوں، فلیٹوں، کھوکھوں، کابکوں میں رہنے پر راضی کررہی ہے۔ اپنی جنت چھوڑ کر یہ شہروں کے جہنم میں جلنے پر خوش ہیں۔ بوڑھے عمر رسیدہ آخر میں وہاں رہ جائیں گے پھر ملٹی نیشنل کارپوریشنز یہ علاقے خرید لیں گی۔ جدیدیت کا سب سے بڑا کارنامہ اور سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ اسے قبول کرنے والا سب سے پہلے اپنی تاریخ کا انکار کرتا ہے، اپنے ماضی اور حال کو اپنی تہذیب، تاریخ، مذہب، اقدار، روایات کو حقیر، بدترین، ذلیل، گھٹیا سمجھتا ہے اور خود کو مغرب کے پیمانوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے تیار ہوجاتا ہے اور اس کی ہر قیمت ادا کرنے کے لیے ہر وقت آمادہ رہتا ہے۔ ماڈرن ازم کی خاص نشانی یہی ہے کہ وہ تاریخ کا انکار کرتا ہے اور اٹھارہویں صدی سے پہلے کے تمام زمانوں کو دور اور جہالت قرون مظلمہ [Dark Ages] قرار دیتا ہے۔ ان کو انسان تسلیم نہیں کرتا اور روشن خیالی کے دور سے انسانیت کا آغاز کرتا ہے۔ لداخ میں جدیدیت (Modrenism) نے کیا ستم ڈھائے؟ جدید سیکولر تعلیم، جدید معیشت، جدید طرز زندگی نے کیا قیامت برپا کی؟ اس روایتی لداخ کی کہانی اگر آپ Helena Noberg کے الفاظ میں پڑھیں تو دنگ رہ جائیں گے۔